فہرست

لمعات

آیئے خود کو قرآن کے آئینے میں دیکھیں	محمد سلیم اختر	3
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویز	5
برہمنیت، پاپائیت اور اِسلام	منصور سرمدی	20
درود کا دینی مفہوم	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	30
اِنّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ	چوہدری محمد آفتاب عروج	37
صلوٰۃ بحیثیت قرآنی نظام	غلام باری، مانچسٹر	46

ENGLISH SECTION

WAR AND PEACE

By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

لمعات

آیئے خود کو قرآن کے آئینے میں دیکھیں

۱۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مومنین کا شیوہ نہیں ہوسکتا لیکن ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مسلمان جھوٹ بولتے ہیں۔

۲۔ قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (۲۲/۳۰)۔ مکر و فریب کی بنائی ہوئی جھوٹی باتوں سے بچو۔ لیکن ہم ایک دوسرے کو فریب دیتے ہیں، تصنع، بناوٹ اور چال بازی کرتے ہیں۔

۳۔ قرآن کا حکم ہے کہ إِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا (۶/۱۵۳) ہمیشہ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرو اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا عمل اس کے یکسر خلاف ہوتا ہے۔

۴۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲) نہ تو حق کو چھپاؤ اور نہ ہی حق و باطل کو گڈمڈ کرو۔۔۔ اور ہم روز ایسا کرتے ہیں۔

۵۔ قرآنِ کریم نے مومنین کا شعار یہ بتایا ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (۲۳/۳) وہ لغو باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں۔۔۔ اور ہمارا سارا وقت لغویات میں گزر جاتا ہے۔

۶۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۲۴/۱۹)۔ ''جو لوگ، معاشرہ میں، بے حیائی کی باتیں پھیلانا پسند کرتے ہیں، انہیں اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا ملنی چاہئے اور آخرت میں بھی''۔ آپ اس تعلیم کو دیکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے اپنے معاشرہ پر اور دیکھئے کہ ہمارے ہاں کوئی گلی، کوچہ، بازار، محفل، مجلس، تفریح گاہ ایسی ہے جہاں فواحش کی تشہیر نہ ہوتی ہو؟

۷۔ خدا کا حکم ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولًا (۱۷/۳۶)۔ ''جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اسکے پیچھے مت لگ جایا کرو۔ یاد رکھو، تمہاری سماعت، بصارت اور قلب سے پوچھا جائے گا کہ جو بات تم نے سنی تھی اسے آگے پھیلانے سے پہلے تحقیق کر لیا تھا کہ واقعی صحیح ہے''! آپ اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے اپنے معاشرہ، بالخصوص اخبارات پر اور سوچئے کہ اس حکم پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے؟

۸۔ اسلام کی تعلیم تھی کہ أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولا (۱۷/۳۴) ہمیشہ وعدہ پورا کرو۔ تم سے اس کے متعلق باز پرس ہو گی (کہ تم نے وعدہ کر کے اسے پورا کیا تھا یا نہیں! اور اگر نہیں کیا تھا تو کیوں؟) اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر اپنے طرزِ عمل پر غور کیجئے۔ کیا ہمارا طرزِ عمل اس کے مطابق ہے؟

۹۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ أَوْفُوا الْكَيْلَ إِذا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ (۱۷/۳۵)۔ ''جب ماپ کر و تو ماپ پورا کرو، اور جب تول کر و تو تول پورا کرو''۔ اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر موجودہ مسلمانوں کے بازارِ خرید و فروخت پر نظر ڈالئے۔ کیا آپ کو

وہاں اس تعلیم کا شائبہ تک بھی دکھائی دیتا ہے۔ أَوْفُوا الْكَيْلَ ۔ کے معنی یہ ہیں کہ خریدار سے جو کچھ لو اس کے بدلے میں اسے اس کی مطلوبہ شے خالص اور پوری پوری دو۔ کیا آپ کو ہمارے کسی بازار میں پورے پیسوں کے عوض خالص اور پوری پوری شے ملتی ہے؟

۱۰۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (۵/۸)۔ ''ہمیشہ عدل کرو۔ کیوں کہ عدل کرنا' تقویٰ سے قریب تر ہے''۔ سوچئے کہ ہمارے معاشرہ میں یہ گراں قدر چیز کہیں سے بھی دستیاب ہوتی ہے؟ واضح رہے کہ عدل سے مراد صرف عدالتی عدل نہیں۔ عدالتی عدل تو' عدل کی صرف ایک قسم ہے۔ عدل زندگی کے ہر گوشے میں مطلوب ہے اور قرآن اس کا تقاضا ہر عبد مومن سے کرتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ ''دشمن سے بھی عدل کرو'' (۵/۸)۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ دشمن تو ایک طرف' ہم دوستوں سے بھی عدل نہیں کرتے۔

۱۱۔ عدل کی بنیاد' سچی شہادت پر ہے۔ قرآن کریم کا اس باب میں ارشاد ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! انصاف کو ہر حال میں قائم رکھو۔ جب کسی معاملہ میں تمہاری شہادت مطلوب ہو تو تم مدعی یا مدعا علیہ کی طرف سے گواہی دینے کے لئے نہ جاؤ بلکہ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ ۔ صرف اللہ کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ اور پھر سچی سچی شہادت دو: وَلَوْ عَلَى أَنفُسِكُمْ ۔ خواہ وہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے: أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ ہو: إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا ۔ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب' تم کسی کی طرف داری نہ کرو: فَاللّٰهُ أَوْلَى بِهِمَا ۔ ان کے مقابلہ میں خدا کا حق فائق ہے۔۔۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَى أَن تَعْدِلُوا ۔ یاد رکھو! ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات کہیں سچی بات کہنے کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ پھر اسے بھی سن رکھو کہ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴/۱۳۵) گواہی دیتے وقت کوئی پیچ دار' ذو معنی بات نہ کہو۔ نہ ہی تم شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ تم انسانوں سے تو ان باتوں کو چھپا سکتے ہو' لیکن خدا سے کسی بات کو چھپا نہیں سکتے۔ مؤمنین کی خصوصیت یہ ہے کہ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ (۲۵/۷۲) وہ کبھی جھوٹی یا ملمع شدہ شہادت نہیں دیتے۔

یہ ہے قرآن کی رو سے' مومنین کی صفت۔ اسے سامنے رکھئے اور پھر اپنے تھانے کچہریوں میں جائیے جہاں (خدا کے فضل سے) سب مسلمان نظر آئیں گے۔۔۔ اور یہ مسلمان' قرآن اٹھا اٹھا کر جو شہادت دیں گے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں!

۱۲۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸)۔ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ: وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ (۲/۱۸۸)۔ نہ ہی حکام کو رشوت دے کر دوسروں کا حق غصب کرو۔

۱۳۔ قرآنِ عظیم کا ارشاد ہے۔۔ مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۔ یاد رکھو! جس شخص نے کسی ایک شخص کو بھی قتل کر دیا۔۔ بجز اس کے کہ اسے قتل یا بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی ہو۔۔۔ تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا: وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲) اور جس نے کسی ایک بے گناہ کی بھی جان بچا دی' اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔

قرآنِ کریم کی اس تعلیم کو سامنے رکھئے اور پھر ہمارے ہاں جس ارزانی سے انسانی خون بہایا جا رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالئے۔ بات واضح ہو جائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(پہلا باب)

سورۃ الملک

(تمہید اور آیات 1 تا 4)

دروسِ قرآن کی مختصر تاریخ

عزیزانِ من! آج ستمبر 1983 کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز 29 ویں پارہ کی سورۃ الملک سے ہو رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے آخری دو پاروں میں ہماری اس راہ گزر کی ایک نئی منزل شروع ہوتی ہے۔ اس کے لیے میں پہلے تمہیداً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس درس کی مختصر سی تاریخ یہ ہے کہ میں نے اس درس کا آغاز کراچی میں 1950 میں شروع کیا جو بڑے حسین اور سادہ انداز میں تھا۔ کراچی سے واقف حضرات جانتے ہونگے کہ وہاں سعید منزل بڑی مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اب تو کراچی بہت بڑھ گیا ہے اس کی حیثیت شاید وہ نہ رہی ہو مگر اس زمانے میں سارا شہر سعید منزل کو جانتا تھا۔ یہ منزل ڈاکٹر سعید مرحوم کے نام پہ تھی۔ آپ بزرگ تھے سن رسیدہ تھے بڑے انقلابی تھے اور ذہنی طور پہ بڑے قرآنی تھے۔ وہ اتوار کی صبح میرے ہاں آیا کرتے تھے اور قرآن کی باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ پرویز صاحب! یہ جو ہم آپ باتیں کرتے ہیں وہ صرف میں سنتا ہوں یہ معاملہ دو تک رہتا ہے اگر اس سلسلے کو کچھ آگے بڑھا لیا جائے تو اور لوگ بھی مستفید ہونگے۔ ان کی اس تجویز کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔ تین سامعین تھے اور میں درس دینے والا تھا۔

میں اس زمانہ میں 23/1 فاؤلرز لائن نیپئر بارکس [1] کراچی میں رہتا تھا۔ یہ سرکاری مکان تھا۔ مکان کے صحن میں ایک چھوٹا سا درخت تھا اس درخت کے سائے میں دو چار پائیاں بچھا لیتے تھے۔ میں دہلی سے تقسیم کے بعد بالکل بے سروسامان آیا تھا تو ان چار پائیوں کے اوپر اس کی ابتداء ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا اور ہمارا دامن تنگ اور سامعین کی تعداد بڑھتی گئی ہم پھیلتے گئے۔ مکان کے باہر ایک بہت بڑا کشادہ میدان تھا اس میں آہستہ آہستہ مانگی تانگی ہوئی کچھ کرسیاں بھی رکھتے چلے گئے۔

---

[1] پرویزؒ: معراجِ انسانیت، ناشر ادارہ طلوعِ اسلام، کراچی، 1949ء، ص۔42۔

بہرحال 1958ء تک میں وہاں رہا' یہ سلسلہ خاصا پھیل چکا تھا لیکن درس موضوعات پر ہوتا تھا' مسلسل قرآن کا درس نہیں تھا۔ موضوعات کے معنی یوں سمجھیے کہ میں قرآن کے بنیادی نظریات وتصورات یعنی Basic Concepts لیتا تھا کیونکہ جب تک یہ سمجھ میں نہ آئیں قرآن کا پیغام سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ وہ بنیادی تصورات دیتا ہے اور باقی قرآن تو صرف ان تصورات کی تشریح' وضاحت اور فروعات میں داخل ہے۔

میں 1958 میں یہاں لاہور آیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے پھر اس سلسلے کو شروع کیا۔ ضمناً فروری 1983ء کے طلوعِ اسلام میں اس کی کچھ روائیداد لکھی ہے۔ اس میں 1953ء لکھا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ 1953ء میں تو میں کراچی میں ہی تھا۔ میں 1958ء میں یہاں 25 / بی گلبرگ لاہور آیا ہوں۔ یہاں آ کر اس کی ابتداء کی۔ پہلے دو سال تک انہی تصورات کے موضوعات پر ہی یہ درس چلتا رہا پھر 1960ء میں ''الحمد'' سے یہ مسلسل شروع کیا گیا۔ یہ جو اس کا پہلا دَور تھا وہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ دسمبر 1967ء میں وہ ختم ہوا تو اس تکمیل پر احباب نے بھی یہاں اس کا ایک جشن منایا تھا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب مجھے چھٹی ملے گی مگر ہوا وہ جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

احباب کا تقاضا یہ تھا کہ نہیں صاحب! اب تو دوسرا دَور شروع ہوگا۔ چنانچہ مارچ 1968 سے یہ اس کا دوسرا دَور شروع ہوا جو اس وقت تک جاری ہے۔ یعنی کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پہلا دَور آٹھ سال میں ختم ہو گیا تھا' دوسرے دَور میں پندرہ سال ہو گئے ہیں اور ابھی آخری دو پارے باقی ہیں۔

ارتکازِ مضامین

عزیزانِ من! یہیں کھڑے ہو کر میں نے کہا تھا کہ اب اس سفر میں ایک نئی منزل آتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ جوں جوں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے' وہ تفصیلات کم کرتا چلا جاتا ہے' حقائق زیادہ دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ نصاب کی کتاب کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ جو باتیں تفصیلات کی ہیں ان کو زیادہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے' اور حقائق چونکہ مرتکز شکل یعنی Concentrated Form کے اندر ہوتے ہیں وہ انہیں بیان کرتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ آخری دو پاروں میں پہنچتا ہے تو یہاں تو پوچھیے نہیں کہ اس ارتکاز کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے: دو دو لفظوں کی ایک ایک آیت ہے اور اگر اس کی تشریح میں جانا چاہیں تو آپ کو اس کے اندر کئی کئی ہفتے لگ جائیں' ایک تو عربی کی زبان ہی عجیب ہے اور اوپر سے خدا کا انتخاب ہے پھر اس کے بعد یہ آخری کتاب ہے اور یہ بھی نہیں کہ اس نے اسے اتنا بڑا

پانچ سات دس پندرہ جلدوں (Volumes) کے اندر بنانا تھا' یہ بڑی مختصر کتاب ہے۔ میرے ہاں ایک ورق میں' شیشے کے نیچے' میں نے تعظیماً وہ رکھی ہوئی ہے، یہ مصر میں شائع ہوا ہے' سارا قرآن ایک ورق کے اندر لکھا ہوا ہے' یہ اتنی سی کتاب ہے۔ آخری دو پاروں میں پہنچ کر اس کے جو حقائق ہیں' وہ بڑے ہی مرتکز شکل کے اندر آ گئے ہیں' اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دو پارے کتنے وقت میں ختم ہونگے۔ آرزو اور دعا یہ ہے کہ میری زندگی ختم ہونے سے پہلے یہ ختم ہو جائیں۔

خارجی کائنات میں رونما ہونے والا انقلاب

عزیزانِ من! قرآن ایک پیغام آفریں کتاب ہے۔ اس نے آخری پاروں میں جو انقلابات پیش کیے ہیں وہ قریباً تین قسموں کے ہیں: ایک انقلاب تو وہ ہے جو خارجی کائنات میں واقع ہوگا۔ اس میں کُرّے آپس میں ٹکرائیں گے' سورج کی روشنی مدھم ہو جائے گی' چاند تاریک ہو جائے گا' ستارے جھڑ جائیں گے۔ یہ کچھ خارجی کائنات میں تبدیلیاں آئیں گی یا کوئی انقلاب آئے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسا ہوگا' کس قسم کا ہوگا؟ مغرب کے جو Scientists (سائنسدان) ہیں وہ اس تحقیق میں لگے ہیں اور آہستہ آہستہ اس طرف آ رہے ہیں کہ یہ نظامِ کائنات ایک دن درہم برہم ہو جانے کو ہے۔ وہ تو ابھی سے کہہ رہے ہیں کہ سورج کی حرارت میں اتنا فرق آ رہا ہے۔ ہم تو ان کی زبان بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے ہاں کی' سائنس اور میتھیمیٹک (ریاضی) کی زبان ہی الگ ہے لیکن وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ کیفیت ہو رہی ہے۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ اگر حرارت میں کچھ زیادہ فرق آیا تو اس کی جو کششِ ثقل ہے جس سے یہ کُرّے اپنی اپنی جگہ معلق ہیں' وہ پاش پاش ہو جائیں گے۔ یہ کُرّے ایک دوسرے کی کشش کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معلق ہیں۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ اگر کسی ایک کُرّے کی کشش میں کسی ایک بال کے کروڑویں حصے کا بھی فرق آ گیا تو یہ ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں گے۔ اس انقلاب کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے' اور پھر خوامخواہ ہم کیوں سر کھپاتے پھریں' ہم تو اس وقت ہونگے بھی نہیں اور اگر ہونگے بھی تو ایک ٹکڑا آیا اور ہم ختم ہوئے۔ بس ٹھیک ہے قصہ ختم۔

دنیائے انسانیت میں عالم گیر انقلاب

قرآن دوسرا انقلاب کچھ عالمگیر قسم کا انقلاب بتا رہا ہے۔ یہ اس انسانی دنیا کے اندر' اقوام کے اندر' ایک قسم کا انقلاب ہے اور بڑا عالمگیر انقلاب ہے۔ وہ ایسا انقلاب ہے جس کے متعلق یہ مترشح ہوتا ہے کہ آخر میں انسانیت' جس نظام پہ آئے گی' وہ وہی نظام ہوگا' جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ یہ دوسرا انقلاب عالمگیر انسانیت کے لیے ہے اور تیسرا انقلاب وہ ہے جو مرنے کے بعد آئے گا' جسے ہمارے ہاں آپ قیامت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان آخری دو پاروں کے اندر' جو کچھ آئے گا' وہ ان میں سے ہی کسی نہ کسی انقلاب کی طرف اشارہ ملے گا۔ اب اس کے بعد بات اشارات میں ہوگی۔

فکرِ قرآنی کو سمجھنے کے لیے قرآنی الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے اور میں بتایا کرتا ہوں کہ الفاظ کے ایک معنی تو لغوی ہوتے ہیں جو ہم روزمرہ کی زبان میں لیتے ہیں اور ایک انہی الفاظ کے مجازی معنی ہوتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے مثلاً ارے! اس کا کیا پوچھتے ہو وہ تو شیر ہے۔ تو وہ یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ سچ مچ کا Animal (حیوان) ہے جو شیر ہے، وہ حیوان ہے۔ اس سے مراد ہوتا ہے کہ وہ بڑا بہادر ہے۔ پانی کو کون نہیں جانتا۔ یہ پانی میرے سامنے رکھا ہے لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ ''پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات'' تو وہاں جو ''پانی پانی'' ہے اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایک گلاس دو گلاس ایک ڈونگا دو ڈونگے پانی ہے، وہاں پانی کے مجازی معنی ہیں۔ قرآنِ کریم کے استعارات اور تشبیہات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی لیے جائیں گے یا مجازی معنی لیے جائیں گے۔ لغوی معنی کے لیے بھی لغت موجود ہے۔ وہ تو آسان بات ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ قرآن کی جو زبان ہم تک جس شکل میں منتقل ہوئی ہے، عربوں کے ہاں ان الفاظ کے جو مجازی معنی لیے جاتے تھے، وہ بھی ہمارے ہاں مل جاتے ہیں۔ میں نے جو لغت مرتب کیا اس میں مجھے بڑا لمبا عرصہ لگا تھا۔ میں نے اس میں ان کے لغتوں کی تائید سے قرآن کے ان الفاظ کے لغوی معنی بھی دیئے ہیں اور مجازی معنی بھی دیئے ہیں جو عرب اس کے لیتے تھے یا جو آج ہم لے سکتے ہیں۔ جو مجازی معنی ہیں وہ کسی خاص دَور تک محدود نہیں ہوتے، جوں جوں دنیا میں اور انکشافات ہوتے جائیں گے، انقلاب آتے جائیں، مجازی معنی کی فہرست اور زیادہ لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ جو مجازی معنی لیے جاتے ہیں انہیں تو اپنے دَور کی علمی سطح پر سمجھانے سے مراد ہوتی ہے، تو وہاں ان میں مجازی معنی لیے جائیں گے اور چونکہ یہ ایسے الفاظ آئیں گے جس میں، میں نے عرض کیا ہے کہ حقائق Concentrated form میں، مرتکز شکل میں، دیئے گئے ہیں، بیشتر معنی مجازی لیے جائیں گے لیکن میں کبھی کسی کو ذہنی طور پر مجبور نہیں کرتا کہ جو مجازی معنی میں پیش کروں وہ انہی کو قبول کریں لہٰذا جی چاہے ان کو قبول کریں، نہ چاہے نہ کریں۔ لغوی معنی کے اعتبار سے آپ قرآن کا کوئی بھی ترجمہ اٹھا لیں گے اس میں ان کے معنی، لغوی طور پہ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں سے بات تو سمجھ میں نہیں آتی لیکن بہرحال جو احباب یہ دیکھنا چاہیں کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کیا ہیں تو وہ میرے ہی لغت کے اندر دیکھ لیں وہاں لغوی معنی بھی دیئے ہوئے ہیں یا کوئی ترجمہ قرآنِ کریم کا اٹھا کے دیکھ لیں، اس میں معنی اس اعتبار سے دیئے ہوئے ہیں۔ تو اس لیے جو میں عرض کرونگا وہ میں بیشتر مجازی معنی کے اعتبار سے ہی پیشِ خدمت کرونگا۔ اب اس آرزو اور اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اتنی مہلت دیدے، زندگی بھی دے اور پھر اتنی توفیق اور صحت بھی دے کہ یہ جو دو پارے ہیں میں انہیں اس طرح ختم کر سکوں کہ جس طرح سے میں مطمئن ہوں کہ میں نے بات سمجھا دی ہے یا میں سمجھ گیا ہوا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اب میری عمر اسی (80) سے اوپر جا رہی ہے، بہرحال اس کی توفیق شاملِ حال ہو تو یہ ماہ و سال تو کچھ شے ہی نہیں ہوتے، اس کے ہاں تو ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا

ہوتا ہے تو اگر وہ دن کا کچھ حصہ بھی عمر میں عطا فرما دیں گے تو بہر حال پھر بات بن جائے گی۔

عزیزانِ من! یہ تو تھی مختصر سی تمہید۔ اب سورۃ الملک کی آیت نمبر 1 سے درس شروع ہوتا ہے: (67:1)

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ (67:1)۔ لغوی اعتبار سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ برکت کا مادہ ''ب رک'' ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''کوئی شے جو اپنی جگہ محکم بھی کھڑی ہو اور نشوونما بھی پا رہی ہو' Develop (نشوونما) بھی ہو رہی ہو۔'' مثلاً درخت۔ کونپل سے اس کو شروع کیجیے۔ وہ اپنے مقام کے اوپر قائم ہوگا' دائم ہوگا' محکم کھڑا ہوگا۔ اگر وہ وہاں سے اکھڑ جائے تو پھر اگلی یہ بات ہے کہ اس میں نشوونما نہیں ہوگی۔ اسے محکم رہنا چاہیے کسی خاص وقت تک کے لیے نہیں بلکہ اس وقت تک جب تک اس کی زندگی ہے۔ اس کے اندر دو شرطیں ہیں: وہ محکم بھی رہے' اور نشوونما بھی پاتا رہے' نشوونما دیتا بھی رہے' چنانچہ ان عربوں کے ہاں بھی برکت کے یہی معنی تھے۔ قرآنِ کریم میں بھی زمین کے متعلق بٰرَکَ فِیْھَا (41:10) کہا ہے۔ اب دیکھیے کہ قرآنِ حکیم عربوں کو کس طرح سے بات سمجھا جاتا تھا۔ زمین اپنے مقام پہ محکم ہے اور اس میں سے سامانِ نشوونما ملتا چلا جاتا ہے' اس کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک بات اور سن لیجیے شاید وہ پہلے نہیں آئی۔ عربی زبان بھی کیا زبان ہے! جو زبان خدا کے فرمان کی متحمل ہو سکے' سوچ لیجیے کہ وہ زبان کیا ہے۔ ایک تو اس کا مادہ ہوتا ہے۔ ''ب رک'' مادہ ہی ہو گیا۔ اس مادے کے اندر یہ بنیادی معنی ہوتے ہیں: اس کا قائم اور محکم رہنا' نشوونما پانا' نشوونما دینا۔ ان کے ہاں اس مادے کے یہ معنی ہیں' اور آگے چلیے' آپ یہ بات سن کے حیرت میں رہ جائیں گے کہ دنیا کی کسی زبان میں یہ بات نہیں ہوگی۔ میں اس زبان کی دوسری خصوصیت عرض کر رہا تھا۔ مادے کر آگے چلیے۔ آپ نے یہ ''ب رک'' دیکھا کہ یہ مادہ ہے اور عربی زبان کے کسی لفظ میں بھی اگر ''ب'' اور ''ر'' اکٹھا آ جائے تو اس میں نمود اور ظہور اور ظاہر ہونے کے معنی ضرور ہونگے۔ کیا زبان ہے! گب [1] H.A.R Gibb نے کہا ہے کہ اس کا ترجمہ کسی بھی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ساری دنیا کو چیلنج دیجیے کہ وہ برکت کا ترجمہ کر دیں' اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ بتا دیں' اس کے لیے Blessing (نعمت) کہہ دینا تو کوئی بات نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ عربی زبان کے جس لفظ کے مادے کے اندر ''ب'' اور ''ر'' اکٹھی آ جائے گی اس میں ''ظہور اور نمود'' کے معنی ضرور ہونگے۔ اور یہ کسی ایک کے لیے نہیں ہے' سب کے متعلق یہی چیز ہے کہ جس لفظ میں

---

[1] ایچ۔اے۔آر۔گب (H.A.R. Gibb) نے اپنی مشہور کتاب ''اسلام میں جدید رجحانات'' (Modern Trends in Islam) میں یہ کہا تھا۔ (ملاحظہ ہو اس کتاب کا ص:4)

یہ دو حرف اکٹھے آ جائیں گے اس کے یہ معنی ضرور ہونگے۔ یہ اس حرف کی خصوصیت ہوگی۔ یہ ہے وہ زبان جس کی عظمت کی گواہی ایچ۔اے۔آر۔گب بھی دیتا ہے۔تو برکت کے معنوں کے لیے میں نے یہ عرض کیا ہے۔اس طرح وہ ذات اپنے مقام پہ قائم' محکم' غیر متبدل' ہے اور سامانِ نشوونما عطا کرتے جانے والی ہے۔اب یہ دیکھیے :بِیَدِہِ الْمُلْکُ (67:1) ملک اقتدار کو کہتے ہیں' اتھارٹی کو کہتے ہیں' پاور کو کہتے ہیں' قوت کو کہتے ہیں' حکمرانی کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ کلی اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے

قرآنِ حکیم نے احکامات کے بالمقابل اصولوں کی زیادہ بات کی ہے

عزیزانِ من! ایک اور بات سمجھ رکھیے۔خدا آپ کو توفیق دے تو کہیں نوٹ کرتے چلے جایئے' پتہ نہیں پھر یہ موقعے آئیں گے یا نہیں آئیں گے۔اللہ تعالیٰ نے بہت تھوڑے سے احکام قرآنِ کریم میں احکام کی شکل میں دیئے ہیں' باقی صرف اصول دیئے ہیں اور وہ اصول ایسے ہیں کہ آپ ان سے اپنے ہاں کا نظام' نظام کا آئین' اس آئین اور دستور کے احکام' ان اصولوں سے مرتب کر سکتے ہیں۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کریں انہیں کافر کہتے ہیں تو وہ یہی نہیں ہے کہ جو احکام کی شکل میں اس نے کہا ہے وہی چیزیں ہیں جو فیصلے کرنے کی ہیں' جو بات اس نے اصول کی شکل میں کہی ہے اگر اس کے بھی خلاف کوئی چلے جا رہے ہیں تو وہ اسلامی مملکت' اسلامی نظام یا اسلامی قانون نہیں ہوسکتا۔اس لیے اگر وہ قرآنِ کریم کے کسی اصول سے بھی ٹکرائے تو وہ اسلامی نہیں ہے۔[1] آپ احباب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے کچھ یہ چیز بھی شروع کی ہے کہ قرآن کے اصولوں سے کس قسم کا آئین' کس قسم کا نظام' کس قسم کے قانون' مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں اصول کیا ہے؟ کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہے اور اقتدار اسی لیے ہے کہ سب کو سامانِ نشوونما مہیا ہوتا رہے' لہٰذا اسلامی نظام کا اصول ہوگیا کہ وہی اقتدار اسلامی ہے جو خیر و برکت کا موجب ہو یعنی سامانِ نشوونما باہم پہنچاتا ہو' Development (نشوونما) کرتا ہو' خیر ہو' برکت ہو۔وہی نظام' وہی اقتدار' اسلامی کہلا سکتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں صفاتِ خداوندی کا عکس

عزیزانِ من! اس اصول سے یہ چیز مستنبط ہوگئی کہ اسلامی یا خداوندی نظام اس کو کہیں گے جس میں علیٰ حدِّ بشریت صفاتِ خداوندی کی جھلک اور عکس ہو۔ بہرحال' خدا نے جو اپنے متعلق صفات بیان کی ہیں تو یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی اپنی تعریف کرا رہا ہے اور یہ

---

[1] ان نکات کی مزید تشریح کے لیے انگریزی زبان میں یہ پمفلٹ ملاحظہ کیجیے:

Prof. Dr. Manzoor-ul-Haque (Compiled): Quranic Constitution in an Islamic State: The Basis of Legislation and Outlines of the Constitution, Idara Tolu-e-Islam (Regd), Lahore, October, 2002.

کہہ رہا ہے کہ ہم ایسے ہیں' ہمارے وہ بڑے ایسے ہیں (معاذ اللہ)۔ یہ جو صفاتِ خداوندی بتائی جارہی ہیں ان کا ہماری زندگی پہ عملی اثر یہ ہے کہ جو ہمارے ہاں نظام قائم ہو' جو زندگی ہم بسر کریں' وہ زندگی اس قسم کی ہونی چاہیے۔ یہ جو اس نے صبغۃ اللہ کہا ہے وہ خدا کا رنگ ہے' اُس رنگ میں رنگے جانے کے تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ کے پہلے کپڑے کے اوپر جو بھی رنگ ہو' وہ باقی نہ رہے' وہی ایک رنگ باقی رہے' جس میں اسے رنگنا ہے۔ اسے توحید کہتے ہیں۔ یہ رنگ کیا ہے؟ یہ رنگ کہاں سے ملے گا؟ خدا نے جو کچھ قرآن میں اپنے متعلق کہا ہے ان سے یہ رنگ مستنبط ہوگا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار ہے' اور اقتدار محکم ہے' وہ اپنے مقام پہ قائم ہے۔ اس کے اقتدار کا مقصد یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما اور Development (نشوونما) کی چیزیں مہیا کرتا چلا جائے۔ یہ اصول قائم ہو گیا' ہمیں اسلامی نظام' اسلامی قانون کا یہ رنگ مل گیا کہ وہ نظام محکم ہونا چاہیے' اپنے مقام کے اوپر قائم ہونا چاہیے لیکن اس کا مقصد سامانِ نشوونما مہیا کرنا ہوگا جبھی وہ جو پہلا ہی قرآن کے اندر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) ہے' وہ قرآن کا ایک اصول ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہی نظام قابلِ حمد وستائش ہے جو ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہو۔

حمد کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ بات نہیں کہ خدا نے کہا ہے کہ سب تعریف خدا کے لیے ہے۔ جو ربِ عالمین ہے' سب تعریف خدا کے لیے ہے کے کیا معنی ہوئے؟ یہ عربی زبان سے پوچھیے کہ ''حمد'' کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ پھر پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ حکیم کیا کہہ گیا ہے۔ یہ ایک اصول دیا ہے کہ جو حمدیت ہے وہ اسی نظام' اسی قانون' اسی اصول' اسی دستور' کے لیے ہے جو رب العالمینی کی شرط پوری کرتا ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن میں یہ چیزیں' جو بظاہر خدا کی صفات کے طور پہ دی ہوئی ہیں' کتنی عظیم حقیقتیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اس سے تو آپ کے ہاں کے نظام کی' دستور کی' حکومت کی' مملکت کی' زندگی کی' پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ (67:1) وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات کا اقتدار ہے وہ از حد فراوانیوں اور خوشگواریوں کی مالک اور ثبات واستحکام اور نشوونما عطا کرنے کی ضامن ہے۔ اسی لیے وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (67:1) ہر شے کے لیے اپنے Measures یعنی پیمانے' قوانین' مقرر کر دیئے ہوئے ہیں۔ یہ اس سورۃ کی پہلی ہی آیت ہے۔ یہ وہی ہے کہ ہر شے اب نشوونما پا رہی ہے۔ یہ Development (نشوونما) کے لیے ہے۔ نشوونما کے لیے کوئی دوسرا لفظ ہمارے ہاں ابھی ہے نہیں' اور یہ لفظ بھی اگر خالصتاً اس اصطلاح میں لیا جائے جس میں Development (نشوونما) کی اصطلاح آتی ہے تو وہ تو ٹھیک ہے ورنہ انگریزی زبان کے اندر بھی Development' آپ سمجھتے ہیں کہ کس کس معنے میں ہو جاتا ہے مثلاً اسے ابھی تک Develop (دھو) نہیں کیا' اسے Develop (دھویا) کر دیجیے۔ یہ تصویریں Develop کرتے پھرتے ہیں۔ تو اس کے لیے یہ چیز ہے یعنی اس نے پیمانے اور قوانین

مقرر کیے ہوئے ہیں۔ان کے مطابق یہ کچھ ہوتا چلا جائے گا۔اب رہی یہ بات کہ اس بات کا ٹیسٹ کیا ہے کہ واقعی Development (نشوونما) ہو رہی ہے۔ یاد رکھیے' کائنات کی جو باقی اشیاء ہیں ان کی تو صرف Physical یا طبعی زندگی ہے' ان کی نشوونما تو دیکھی جاسکتی ہے' محسوس ہوتی ہے۔ پودا اگ رہا ہے یا نہیں اس میں پھل آ رہا ہے یا نہیں' بچہ تندرست و توانا ہے یا نہیں' بڑھ رہا ہے یا نہیں' کسی مقام پہ بھی اگر کچھ وقت کے لیے اسکا قد رک جاتا ہے' بڑھنا رک جاتا ہے' تشویش پیدا ہو جاتی ہے یعنی یہ Development (نشوونما) وہ ہے' یہ نشوونما یعنی Growth وہ ہے جو محسوس شکل میں سامنے آ جاتی ہے' دیکھی جاسکتی ہے۔انسان کا جسم بھی اسی سے متعلق ہے' طبعی جسم ہے' طبعی نشوونما ہوتی ہے' تندرست ہے' توانا ہے' صحت ہے' وہ قد کے اعتبار سے بھی بڑھ رہا ہے' توانائی بھی اس میں آ رہی ہے۔

حیاتِ انسانیت کا دارومدار نفس انسانی کی نشوونما کا رہین منت ہے

عزیزانِ من! یہ تو ہوئی ایک بات لیکن انسان صرف طبعی زندگی کا نام نہیں ہے۔اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جس کے لیے قرآن کا تو لفظ ''نفس'' ہی ہے جسے ذات' خودی' Personality (شخصیت) Individuality (انفرادیت) کہتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی نام بھی وہ Concept (تصور) نہیں دے سکتا جو ''نفس'' کا ہے۔انسان انسانیت کے درجے میں آتا ہی اس ''نفس'' کی رو سے ہے۔ Physical Body (طبعی جسم) کے اعتبار سے تو یہ حیوانات کے زمرے میں آتا ہے۔انسان کے اندر وہ شے ہے جس کی Development (نشوونما) کے لیے یہ صفاتِ خداوندی ہیں۔ان صفات کو آپ Permanent Values یا مستقل اقدار کہیں گے۔ یہ ان سے نشوونما پاتا ہے۔قرآن کے ایک اصول کی رو سے انسان کا جسم ہر اس شے سے نشوونما پاتا ہے جو وہ لیتا ہے' کھاتا ہے مگر انسان کی ذات اس شے سے نشوونما پاتی ہے جو وہ دوسروں کی بہبود کے لیے دیتا ہے۔اب وہ جو شے اندر ہے وہ دیکھی نہیں جاسکتی' محسوس نہیں کی جاسکتی' دوسرا نہیں محسوس کرسکتا' خود اگر انسان کی اپنی آنکھیں ہوں' بصارت ہی کی نہیں بلکہ بصیرت کی آنکھیں بھی ہوں' تو وہ اپنے متعلق تو محسوس کرسکتا ہے کہ کس حد تک وہ ذات نشوونما پا چکی ہے۔قرآن نے جو مومنین کے خصائص بتائے ہیں' خصوصیات بتائی ہیں' وہ حقیقت میں اس کی ذات ہی کی نمود ہے' اس ہی کا ظہور ہے' اس کے شواہد ہیں جس کو اس نے بیان کیا ہے' مثلاً اگر اس نے مومن کے متعلق کہا ہے کہ وہ خود تنگی میں بھی گزارا کرلے گا دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پہ ترجیح دیدے گا۔ یہ انسان کے جسم کے بس کی بات نہیں ہے' یہ اس چیز کے بس کی بات ہے جسے اس نے نفس کہہ کر پکارا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جو یہ کرے اور بطیبِ خاطر کرے اور اس میں اس کو خوشی محسوس ہو کہ خود تنگی میں رہا ہے' دوسرے کی ضرورت جو اس سے زیادہ تھی' اس کو اس نے پورا کر دیا ہے۔ یہ کونسی چیز ہے جو یہ فیصلہ کرے گی۔اس کے لیے' جسم تو اس کا فیصلہ کر نہیں سکتا۔انسانی جسم کی نشوونما تو

Instinct (جبلت) جسے حیوانات کی جبلت کہتے ہیں اس پہ پاتی ہے۔ کوئی حیوان بھی اپنی زندگی کے اوپر دوسرے کو ترجیح نہیں دے گا' انسان بھی' جب جسمانی سطح پہ ہوگا' حیوانی سطح پہ ہوگا' تو اس کی بھی یہی کیفیت ہوگی بلکہ یہ تو لوٹتا کھسوٹتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو باقی چارے کے متعلق اس کو پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی دوسرا بیل کھا جاتا ہے یا کون لے جاتا ہے' وہ بڑے مزے میں بیٹھا ہوا' آنگے بانگے کیے ہوئے' جگالی کرتا ہے۔ یہ یہی حیوان ہے کہ اس کی ضرورت تو دو روٹیوں کی ہے لیکن ساری عمر اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ حیوان میں یہ ہوس نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ جب یہ گرتا ہے تو یہ حیوانات سے پس ترین درجے میں جاتا ہے۔ انسانیت کا درجہ وہ ہے جس کے ماپنے کا پیمانہ وہ صفات ہیں جو قرآن نے مومن کی صفات گنائی ہیں: تکریم انسانیت یعنی کسی انسان کی بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ رنگ' نسل' زبان' عمر' مذہب' دولت' منصب کے اعتبار سے کیا ہے' محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہر انسان کی عزت کرنا' تکریم کرنا' یہ نفسِ انسانی کا خاصہ ہے' جسمِ انسانی کا نہیں۔ جسمِ انسانی میں تو جو تگڑا ہوگا' وہ غریب کو دبا لے گا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے پیغام کو سمجھنے کے لیے یہ چیزیں ہیں' یہ سمجھنی ضروری ہیں۔

اب اس نے یہ کہا ہے کہ کیسے معلوم ہو کہ یہ نشوونما پاتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہیں؟ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** (67:2) تم اپنے آپ کو ٹیسٹ کر سکو کہ تمہاری ذات کس حد تک نشوونما پا چکی ہے' اس کے لیے اس نے یہ کہا ہے کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں کیفیت یہ نہیں ہوگی کہ جسمانی طور پر جو پہلوان ہوگا وہ وہاں بڑا تگڑا ہوگا' نہیں بلکہ جس کی ذات نشوونما پا کے اس معیار تک پہنچ چکی ہوگی کہ وہ اس منزل سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہوگئی ہو یا وہ یہ صلاحیت رکھتی ہو تو وہ اگلی منزل میں چلی جائے گی' جسے قرآن جنت کی زندگی کہتا ہے اور اس کے برعکس یہاں جس ذات کی نشوونما رک گئی ہوگی' وہ اگلی زندگی میں وہیں کھڑی ہو جائے گی' آگے نہیں جا سکے گی' اسے جہیم کی زندگی کہا گیا ہے۔ جہیم کے معنی ہی روک دینے والی چیز ہیں جو کسی کو آگے نہ بڑھنے دے۔

موت کا ذائقہ انسانی ذات کی کامرانی اور نشوونما کا پیمانہ ہے

عزیزانِ من! موت وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنا یہ ٹیسٹ کر سکتا ہے کہ میری ذات کی اتنی نشوونما ہو چکی ہے یا نہیں کہ میں اگلے درجے میں Promote (ترقی پانا) کیا جا سکوں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر اسکولوں یا کالجوں کے اندر امتحان نہ ہوں تو دوسروں کو پتہ ہی نہ چل سکے' خود طالبعلم کو بھی پتہ نہ چل سکے کہ وہ کتنا قابل ہو گیا ہے۔ امتحان کو ٹیسٹ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس طالبعلم کی قابلیت کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ انسان کی ذات کی Development (نشوونما) کا' جسے آپ ٹیسٹ کہیں گے' وہ ٹسٹ ایک چیز ہے جس کا نام موت ہے جس سے یہ چیز ہویدا ہوگی۔ یہاں کہا کہ خدا نے موت اور زندگی کو الگ الگ پیدا کیا۔ اس آیت میں اگلی چیز

لِيَبْلُوَكُمْ (67:2) ہے۔اس کا عام ترجمہ کرتے ہیں ''تا کہ اللہ آزمائے۔'' تو کیا اللہ کو بھی آزمانے کی ضرورت ہے؟ آزماتا تو وہ ہے جسے خود اس کے متعلق معلوم نہ ہو۔ کسی دوست سے کوئی بہت بڑی چیز کہنا کہ صاحب! مجھے ضرورت ہے' میری یہ مدد کرو۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد وہ آخر میں کہے گا کہ ''میں تے تینوں ایویں ازماندا ساں پیا۔ اوکی خیال اے پئی' اللہ میاں وی ازماندے رہندے نیں بیٹھے ہوئے۔'' [1] خدا آزماتا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ابتلا کا یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ابتلا تو مصیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عربی مبین میں ابتلا کے معنی ہوتے ہیں ''پہلو بدلنا' گردش کرنا تا کہ کوئی اپنے آپ کا ٹیسٹ کر سکے۔'' خدا اسے ٹیسٹ نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنا ٹیسٹ کر سکے۔ امتحان میں جو لڑکے کا ٹیسٹ لیا جاتا ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ کوئی پروفیسر ٹیسٹ کرتا ہے۔ وہ لڑکا خود اپنا ٹیسٹ کر رہا ہوتا ہے کہ مجھ میں کتنی قابلیت آ گئی ہے۔ موت اور زندگی' بظاہر بڑی متضاد چیزیں نظر آتی ہیں لیکن یہ تو اصول ہے' یہ جو Scientific Progress (سائنسی ترقی) والے ہیں وہ بھی بتاتے ہیں کہ ٹکراؤ سے انسان کی توانائیاں بڑھتی ہیں' ٹکراؤ نہ ہو تو اُن کی نمود ہی نہیں ہوتی۔ ٹیسٹ کے لیے بھی وہ ٹکراؤ والی بات ہوتی ہے۔ وہ بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ یہ مختلف قسم کے جن کو بظاہر ہم تضادات کہتے ہیں' وہ Conflicts (تصادمات) ہوتے ہیں' جن سے ٹکراتے ہوئے انسان یہ دیکھتا چلا جاتا ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں۔ جسمانی طور پہ بھی جب تک آپ کسی چیز سے ٹکرائیں نہیں تو اس وقت تک معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ بوڑھے پہلوان کو کسی نے کہا تھا کہ بڑے میاں! اب وہ بات نہیں رہی جو جوانی میں تھی۔ کہنے لگے کہ نہیں صاحب! اب بھی ہماری وہی بات ہے' کچھ کمی نہیں ہوئی۔ کہنے لگے: کیسے؟ کہا کہ ابھی میں تجھ کو دکھائے دیتا ہوں۔ کہنے لگے: چلو۔ اکھاڑے کے کنارے پہ ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہوا تھا۔ یہ گئے۔ بڑے میاں اکھاڑے میں اترے۔ اس پتھر کے اوپر یہ کیا' اور اُدھر سے زور لگایا۔ وہ ہلا ہی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے: دیکھا بڑے میاں! نہیں ہلا۔ کہنے لگا: ٹھیک ہے جوانی میں بھی نہیں ہلا کرتا تھا' اب بھی نہیں ہلا۔ ایک ٹیسٹ یہ بھی ہوتا ہے' مگر یہاں قرآن کہتا ہے کہ لِيَبْلُوَكُمْ (67:2) خود انسان کی طبعی موت بھی اس کی ذات کی صلاحیتوں کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

عزیزانِ من! موت تو عجیب چیز ہے۔ ایک تو موت کا انداز ہی ایسا ہے مگر وہ اپنے انداز کی بات ہے جو غالب [2] (1797-1869) کہہ گیا ہے کہ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

---

[1] میں تو آپ کو ایسے ہی آزما رہا تھا۔ ارے کیا خیال ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ بھی بیٹھے ہوئے آزماتا رہتا ہے۔

[2] غالب: مرزا اسداللہ خان: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002ء۔ ص 38

یہ غالب بھی عجیب شخص تھا: بھاگ دوڑ' جدوجہد' یہ لے' وہ کر' یہ بنا' اور ایک بزنس کا ٹھیکہ لے لے۔ وہ یہ سارا کچھ کہتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ پتہ ہے کہ کل کو مرجانا ہے۔ اگر پتہ ہو کہ اللہ کی طرح مرنا ہی نہیں ہے تو پھر اس جلدی کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر تو ٹھیک ہے کہ او کرلواں گے' کیہڑی جلدی پئی ہوئی ہیگی۔ یہ جو جلدی پئی ہوئی ہوندی ہیگی اے' یہ موت کی وجہ سے ہے۔ [1] اور یہ ہے جسے ہوس کہا جاتا ہے: یہ بھی لو' اور وہ بھی لو۔ اب یہ شعر پھر دہرایئے اور پھر میری طرح اس سے لذت لیجیے کہ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟ [2]

لیکن یہاں جو قرآن کہتا ہے' وہ ہوس کے لیے نہیں کہتا۔ وہ تو چیز ہی کچھ اور ہے۔ وہ تو جسے محسوس ہو کہ مجھ میں اتنی قابلیت آ گئی ہے اور امتحان یا ٹیسٹ ہوا تو میں اگلی کلاس میں پروموٹ ہو جاؤنگا' اس کی تو کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے لڑکوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ امتحانات ہی Post pone (ملتوی) ہو جائیں۔ یہ سب نالائق ہوتے ہیں۔ جنہیں پتہ ہے کہ اگر ٹیسٹ ہوا تو ہم فیل ہو جائیں گے' اور جس طالبعلم کو یقین ہو کہ میں نے پروموٹ ہونا ہے' وہ تو تقاضا کر کے بھی کہے گا کہ خدا کے لیے کل کیوں لیتے ہو' آج لیجیے۔ اس کو اپنی قابلیت پر یقین ہے۔ جس کو یہاں یہ یقین ہوتا ہے وہ موت کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے:

موت کا مرحلہ انسانی زندگی کو حسین ترین منزل سے متعارف کرانے کا ذریعہ ہے

عزیزانِ من! وہ کامیاب طالبعلم بھاگا ہوا گھر آئے گا کہ میں پاس ہو گیا' مجھے پروموشن مل گئی۔ اس کے لیے موت تو یہ کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ کاہے کے لیے یہ موت ہے؟ لِيَبْلُوَكُمْ (67:2) ہم پہلو بدلتے ہیں' مواقع بہم پہنچاتے ہیں' گردش دیتے ہیں' آپ اس کے کچھ معنی کیجیے۔ یہ گردش اس لیے دیتے ہیں کہ دیکھیں کہ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (67:2) تم کس قدر عمدہ عمل کرتے ہو۔ کیا ایک لفظ کہہ گیا صاحب! اب لفظ یہ ہے کہ تم نے زندگی میں کس قدر احسن عمل کیا۔ یہ عملِ احسن کیا چیز ہے؟ جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا ہے یہ لفظ اس کے لیے آیا ہے۔ سورۃ التین میں کہا تھا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ o ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ [3] (95:4-5)۔ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مگر اس کو احسن تقویم میں پیدا کیا گیا تھا۔ اب میں اس احسن کا

---

[1] کرلیں گے' کونسی جلدی پڑی ہے۔ یہ جو جلدی پڑی ہوتی ہے یہ موت کی وجہ سے ہے۔

[2] غالب' مرزا اسداللہ: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002' ص۔38

[3] یہ (حق و باطل کی) کشمکش اس لیے ہوتی ہے کہ ہم نے انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی ہے کہ یہ اپنی ذات کی نشوونما کر کے حسن کارانہ انداز سے بہترین توازن کی زندگی بسر کرے لیکن اس کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے حیوانی زندگی کی پست ترین سطح پر لے جاتی ہیں۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کیا ترجمہ کروں۔ یہ حسن کی بلند ترین ڈگری ہے' جسے آپ انتہائی حسن کہہ سکتے ہیں لیکن یہ حسن جسم کا نہیں ہے' اگرچہ وہ بھی قابلِ نفرت شے نہیں لیکن یہ حسن تو انسانی ذات کا حسن ہے' اور حسن تو نام ہی صحیح Proportion (تناسب) اور توازن کا ہے۔

ذاتِ انسانی کا مقام صرف حسن تک محدود نہیں بلکہ احسن کے مقامِ بلند تک کا ہے

جب آپ اس کو حسن کی بجائے احسن کہیں گے تو پھر تو پوچھیے نہیں کہ وہ کیا ہو جائے گا۔ تو مقصود یہ تھا کہ انسان ایسی زندگی بسر کرے کہ اس کی ذات [1] احسن ہو جائے لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کم بخت اپنے آپ کو گراتا ہے تو پست سے پست تر درجے میں چلا جاتا ہے جو ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ حیوان سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ تو جو احسن ہونا ہے یہ Balanced Personality (متوازن شخصیت) کی سی ایک دوسری چیز ہے۔ اگر آپ اسے Balance یعنی متوازن کہیں گے تو پھر احسن کے لیے کیا لفظ لائیں گے۔ یہ انگریزی زبان کے لفظ Beauty (خوبصورتی) وغیرہ سے وہ بات نہیں بنتی۔ اس کے اندر' دراصل مقامِ احسن میں یہ دیکھنا ہے کہ اس نے زندگی میں جو عمل احسن کیا ہے' کیا اس نے اس کو احسن بنایا ہے یا نہیں؟ چنانچہ انسان سے خدا کا مقصود و مطلوب یہ تھا کہ تیری زندگی احسن ہو جائے۔ یہ وہی ہے جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے۔ کیا بات یہ شخص کہہ جاتا ہے! اس نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ قرآن کرتا کیا ہے:

آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

جو خدا چاہتا ہے کہ تو اس قسم کا بن جائے تو قرآن تمہیں اس قسم کا بنا دیتا ہے۔ بات تشریح میں آنے کی نہیں تھی کیونکہ اگر آپ حسن کی تشریح کریں گے تو آپ پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیں گے۔ یہ تو صرف Appreciate (بنظرِ تحسین دیکھنا) کرنے کی چیز ہوتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کا بھی کمال یہ ہے کہ اس نے تجزیہ نہیں کیا' اس کا Analysis (تجزیہ) نہیں کیا' بلکہ صرف یہی کہا کہ قرآن کیا کرتا ہے' کرتا یہ ہے کہ

آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

اور حق کیا چاہتا ہے؟ حق چاہتا ہے: احسنِ تقویم۔ کہا ہے کہ یہ جو موت اور حیات ہے اس کا تضاد اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ تمہیں ایسے مواقع میسر آ جائیں کہ تم وہ کچھ بن جاؤ جو کچھ بنانا خدا کا مقصود تھا۔ خدا نے بنا بنایا ہوا انسان نہیں دیا' جس طرح سے اس نے طبعی زندگی میں یہ جو جنین ہوتا ہے وہ جب رحمِ مادر میں ہوتا ہے اس کو تو چھوڑ دیجیے جب بچہ بھی پیدا ہوتا ہے تو وہ بنا بنایا ہوا' نشو و نما یافتہ' بڑا انسان تو

---

[1] اقبال کے الفاظ میں: ''پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی''

نہیں ہوتا' وہ تو ایک ہیولے کی شکل کے اندر ایک انسان سا ہوتا ہے لیکن اس میں انسان بننے کی صلاحیتیں اور استعداد رکھ دی جاتی ہیں کہ اس کی مناسب نشوونما ہوتی چلی جائے تو وہ بڑھتا پھولتا پھلتا جوان ہوتا' بڑا ہوتا' انسان بن جاتا ہے۔ یہی چیز انسان کی ذات کی ہے۔ اس کو Undeveloped (غیر نشوونما یافتہ) شکل کے اندر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن نے جو راہنمائی دی ہے' اگر اس کے مطابق زندگی بسر کرو گے تو پھر جو تمہاری Undeveloped (غیر نشوونما یافتہ) صلاحیتیں ہیں وہ Develop (نشوونما یافتہ) ہو جائیں گی اور اس کے لیے جو معیار ہے وہ وہی احسن ہونا ہے۔ وہ حسین تک بھی نہیں محدود رکھتا وہ تو تمہیں احسن بنانا چاہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عزت کا مفہوم

اس احسن بننے کے لیے پھر دو چیزوں کی ضرورت آ گئی۔ میں نے کہا ہوا ہے کہ آیت کے آخر میں جو خدا کی دو صفتیں آتی ہیں وہ آیت کا جو مفہوم ہے وہ اس کی وضاحت نہایت بے تابی سے کر دیتی ہیں۔ اس کے لیے وہ دو چیزیں چاہئیں اور وہ ہیں: وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (67:2)۔ اس کے لیے خدا کی ایک صفت تو عزیز ہے۔ آپ کو معلوم ہے اور میں نے کہا تھا کہ عزت کے معنی یہ نہیں جو ہمارے ہاں عزت ہوتی ہے۔ وہ ہمارے ہاں والے تو گاؤں کے لوگ یا عام بازاری سے لوگ بھی ہیں۔ غصہ چڑھا' اس کو گالی دے رہے ہیں۔ کہنے لگے: کیا ہوا؟ کہنے لگا: اپنے میری بے عزتی خراب کر دتی ہے' بے عزتی خراب کر دتی ہے' نہیں سمجھے' [1] عزیزانِ من! عربی زبان میں عزت کے معنی یہ نہیں ہوتے۔ اس کے معنی غلبہ ہوتے ہیں' قوت ہوتی ہے' تسلط ہوتا ہے۔ اب اس قسم کی زندگی کے لیے جو حسن پیدا کر دے اسے دو چیزوں کی ضرورت ہے: قوت کی ضرورت ہے' غالب آنے کی ضرورت ہے' ہر جگہ مار کھانے کی ہی بات نہیں ہوتی مگر ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ ہو جا ککھ مسیت دا۔ [2] یہ بات نہیں ہے۔

غلبہ اور حفاظت کے ملاپ کا نام ہی اسلامی نظام ہے

عزیزانِ من! اس سوکھ کر لاغر و نزار ہونے میں تصوف ہے' ویدانت ہے۔ اس میں فلسفہ یہ ہے کہ ضعیف سے ضعیف تر کرتے چلے جاؤ۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم انسان کو قوی سے قوی تر کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس کو اعلون بناتا ہے۔ خدا عزیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا غلبہ ہے۔ وہ غفور ہے۔ یوں کہیے کہ غریبوں کی' کمزوروں کی' ضعیفوں کی' حفاظت کرتا ہے۔

---

[1] اس نے میری بے عزتی خراب کر دی ہے۔ (ہاں) بے عزتی خراب کر دی!! کیا نہیں سمجھے آپ!

[2] سوکھ کر لاغر و نزار ہو جا۔

عزیزانِ من! غلبہ اور حفاظت اکٹھے ہو جائیں تو اسلامی نظام بن جاتا ہے' ورنہ دوسرے کو کچلنے کے لیے غلبہ تو چنگیز اور ہلاکو بھی حاصل کر لیتے ہیں' ہر آمر حاصل کر سکتا ہے۔ عزیز کے ساتھ غفور ہونا اسلامی نظام کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح ملک کے ساتھ برکت ہونا ہے' اسی طرح عزیز کے ساتھ غفور ہونا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ صفاتِ خداوندی کا ہے کے لیے دی ہوئی ہیں؟ خدا اپنا تعارف نہیں کرا رہا کہ ہم ایسے ہیں' اور ہم ایسے ہیں۔ اس سے ہی انسانی ذات کی نشوونما ہوگی' اتنی قوت ہوگی کہ مظلوم کی حفاظت کے لیے ظالم کی کلائی مروڑ سکے اور اگر مظلوم کی کلائی مروڑے گا تو پھر وہ درندہ ہو جائے گا' مومن نہیں ہوگا اور اگر دوسرے کی کلائی مروڑنا تو ایک طرف رہا' اپنی بھی حفاظت نہ کر سکے تو پھر وہ تو حیوان بھی نہیں ہوتا۔ یہاں "اَلْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ" (67:2) آیا ہے یعنی خدا اپنے تمام پروگرام پر غالب ہے اور اُسے ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی صفات مومن میں ہوتی ہیں۔

ہم نے قرآنِ حکیم کی طرز پر خارجی کائنات کو بطور شہادت پیش کرنا چھوڑ رکھا ہے۔

عزیزانِ من! اب بات آگے آتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ جو حقائق بیان کرتا ہے' ان کی شہادت کے لیے خارجی کائنات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اب جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ جب سے ہم نے قرآن کے نظام کو چھوڑا ہے' اس کے آئین کو چھوڑا ہے' اس کے حقائق کو چھوڑا ہے' اس کی تعلیم کو چھوڑا ہے تو اس وقت سے وہ جو یہ شہادتیں پیش کرتا ہے' وہ بھی ہمارے لیے بے معنی ہو گئیں ہیں کیونکہ یہ شہادتیں تو انہیں کام دیتی ہیں جو ان چیزوں کی Scientifically (سائنسی) تحقیق کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ ہماری جو زندگیاں ہیں وہ ایک پرانے شعر پر فٹ بیٹھتی ہیں:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

لیکن مومن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی اس کے برعکس اس میں یہ صفت ہوتی ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

عزیزانِ من! زندگی کے حقائق کو سمجھنے کے لیے خارجی کائنات کو دیکھیے۔ اس کے لیے کہا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقاً (67:3) ہم نے اس فضا کی پہنائیوں میں مختلف کرّے پیدا کیے ہیں۔ اب یہاں لفظ ''طباق'' آیا ہے۔ اس کے معنی عام ترجمے یوں کر جائیں گے: اوپر تلے' ایک کے اوپر دوسرا۔ یہ اس کے بنیادی معنی نہیں ہوتے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''وہ چیزیں جو کسی ایک قانون کے تابع سرگرمِ عمل ہوں' ان کا ایک اصول ہو' وہ ایک دوسرے کے ساتھ بنیادی طور پر مطابقت رکھتی ہوں' مثلاً بجلی یا Electricity کا ایک بنیادی اصول ہے: جتنی چیزیں بجلی سے چلیں گی اُن کی ایک دوسرے سے اس اصول کے اعتبار سے مطابقت ہوگی۔ یہاں قرآن سبع کہہ جاتا ہے۔ وہ ان کی تعداد نہیں بتاتا۔ اس کے معنی سات نہیں بلکہ ''بکثرت'' کے ہیں' یعنی کُرّے بکثرت ہیں لیکن جس بنیادی اصول کے مطابق وہ کارفرما ہیں' وہ مصروفِ حرکت ہیں' ان میں ایک دوسرے سے مطابقت

کے اوپر یقین تھا جو زمین پہ تجربے کرنے کے بعد یہ لوگ چاند پہ بھی چلے گئے۔ تو جو اصول یہاں کارفرما ہے، وہی اصول وہاں کارفرما ہے، شکل بدلے گی، ہئیت بدلے گی، حرکتوں میں فرق آجائے گا لیکن بنیادی اصول وہی ہے جو یہاں ہے، چنانچہ ہر کُرّے کے اندر بنیادی اصول وہی کارفرما ہے جو ایک کُرّے کے اندر ہے۔ اس لیے ''طباقاً'' کے معنی ہیں: باہمد گر ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد قرآن کی جو آیات آرہی ہیں، خالص ادب کے اعتبار سے بھی، وہ قرآن کی حسین ترین آیات میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس وجد آفریں انداز سے Describe (بیان) کیا ہے کہ اگر انسان ان الفاظ پہ یا اس انداز پہ اور اس اسلوب پہ غور کرے، Appreciate (بنظرِ تحسین دیکھنا) کرے تو وجد میں آجاتا ہے۔ میں نے اپنے مفہوم القرآن میں اپنی استعداد کے مطابق ادبی انداز سے ہی ان آیات کا مفہوم لکھا ہے۔ پہلے میں یہ آیات پڑھنے کے بعد مفہوم القرآن آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں وہاں سے بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔

کائنات میں بکھرے ہوئے ان گنت کُرّوں کے مابین باہمی ربط کی کیفیت

یہ کہا کہ **مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ o فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ o ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ** (67:3-4) (اگر تم دیکھنا چاہو کہ اس کا پروگرام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کی صفاتِ ربوبیت اور حفاظت (رحمت و قدرت) کس حسن و خوبی سے بیک زمان کارفرما ہیں تو کائنات کی اس عظیم القدر مشینری پر غور کرو) اس نے فضا کی پہنائیوں میں مختلف کروں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ (ان میں باہمی تصادم نہیں ہوتا) تم یہاں سے وہاں تک دیکھ جاؤ، تمہیں خدائے رحمٰن کی تخلیق کردہ کائنات میں کہیں بے ترتیبی یا عدمِ تناسب نظر نہیں آئے گا۔ تم ایک بار نہیں، بار بار نگاہ کو لوٹا کر دیکھو، خوب جانچ پڑتال کر کے غور کرو، تمہیں کہیں کوئی دراڑ یا درز دکھائی نہیں دے گی۔ کوئی شے بے جوڑ یا ان مل نہیں ہوگی۔ تم طائر نگاہ کو فضا کی پہنائیوں میں بار بار اذنِ بال کشائی دو اور اس سے کہو کہ وہ خوب اچھی طرح سے دیکھے کہ کائنات میں کہیں کوئی اختلال ہے۔ وہ ہر بار 'واماندہ و درماندہ' کا شانۂ چشم میں لوٹ آئے گا اور اسے کہیں اختلال و فتور دکھائی نہیں دے گا۔ (یہ ہے اس کائنات کا نقشہ جس میں ہر شے ہمارے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ اگر تم بھی اپنی دنیا میں ہمارا نظام قائم کرلو تو تمہارے معاشرے میں کس طرح فساد کی جگہ اصلاح اور اختلاف کی جگہ باہمی موافقت پیدا ہو جائے گی) یہ ہے، عزیزانِ من! جو میں نے ان دو آیتوں کا مفہوم لکھا ہے۔ اگر الفاظ کے لیے ضرورت ہوئی تو میں پھر عرض کر دونگا۔ آج درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ یوں کہیے کہ ہم سورۃ الملک کی ابتدائی آیات میں ہی ہیں اور اسی سے ہم آگے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀.....❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدیؔ، راولپنڈی
mansoor_sarmadi@yahoo.com

برہمنیت، پاپائیت اور اِسلام

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

(اقبالؒ)

خدا کی طرف سے تمام دنیا کے لوگوں کو انبیائے کرام کی وساطت سے وحی کی شکل میں دین عطا ہوا کرتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ گذرنے کے بعد اس میں انسانی خیالات کی آمیزش شروع ہو جاتی تھی اور یوں دین رفتہ رفتہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین اور مذہب میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ دین میں اجارہ صرف وحیِ خداوندی کا ہوتا ہے جبکہ مذہب میں مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری (Monopoly) ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو مذہب قرار دے دیں، کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ مخالفت کر سکے۔ اس میں یہ حق صرف مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ بزعمِ خویش خداوندی احکام کی تشریح و تعبیر کر سکے۔ مذہب میں انہی کا فرمایا ہوا مستند شمار ہوتا ہے جبکہ دین میں صرف خدا کی بات چلتی ہے اور تو اور، دین میں خود پیغمبر بھی اپنی طرف سے کوئی بات منوانے کا مجاز نہیں ہوتا (۳/۷۸)۔ وہ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ (۹/۴۲، ۱۵/۱۰)۔

جو کچھ مجھ پر وحی کیا گیا ہے میں اس کے سوا کسی چیز کا اتباع نہیں کرتا۔

مذہبی پیشوائیت کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، نسبی پیشوائیت اور کسبی پیشوائیت۔ نسبی پیشوائیت کی مثال کے طور پر ہندو دھرم کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں مذہبی معاملات پر بات کرنے کا حق صرف ایک مخصوص ذات برہمن سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ہوتا ہے۔ باقی ذاتوں کے لوگ، ایسے معاشرے میں محض تابع مہمل بن کر جیتے ہیں۔ کسبی پیشوائیت میں کوئی بھی شخص کسی مذہبی مدرسے میں خاص مذہبی نصاب کی تعلیم حاصل کر کے سند حاصل کر لیتا ہے اور یوں وہ مذہبی معاملات پر بولنے کا اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ مذہبی تعلیم کی سند کے بغیر کسی دوسرے شخص کو مذہبی

معاملات پر بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی مثال کے طور پر عیسائیت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

اہل یورپ کو قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کا وہ دور اب بھی یاد ہو گا جب پاپائے روم کے اشارۂ ابرو پر حکومتوں کے تختے الٹ جایا کرتے تھے' جب بزعم خویش جنت کے ٹکٹ مہنگے داموں فروخت ہوا کرتے تھے اور جب قتل و زنا سمیت تمام جرائم خانۂ اعتراف (Confession Box) میں محض اقبال جرم کر لینے سے بزعم خویش خدا سے معاف کروا لیے جاتے تھے۔

قرآنی اسلام نہ نسبی پیشوائیت کو تسلیم کرتا ہے نہ ہی کسی پیشوائیت کو۔ اس میں نہ برہمنیت کا گذر ہو سکتا ہے نہ ہی پاپائیت (Priesthood/Papacy) بار پا سکتی ہے۔ بلکہ وہ تو آیا ہی بنی نوع انسان کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے چھڑانے کے لئے تھا۔ اقبال کے الفاظ میں:۔

نقشِ قرآں تا در ایں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پاپا شکست

امت کی حرماں نصیبی کہ قرونِ اولیٰ کے بعد رفتہ رفتہ اسلام بھی دین سے مذہب میں تبدیل ہو گیا اور یوں مذہبی پیشوائیت نے اس میں بھی اپنی اپنی سیادتیں قائم کر لیں۔ دین اور دنیا کی ثنویت (Duality) پیدا کر کے دنیاوی قوانین (Public Laws) حکمرانوں کے سپرد کر دیے گئے اور شخصی قوانین (Personal Laws) کی تعبیر و تشریح اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ امت کی رگِ جاں ملائیت کے شکنجے میں کسی ہوئی ہے۔

۲۰۰۶ء میں جب تحفظِ حقوقِ نسواں بل ایوانِ زیریں اور ایوانِ بالا سے منظور ہو کر آئین کا حصہ بن گیا تو ہمارے احبارِ کرام اور رہبانِ عظام کو شدید صدمہ پہنچا کیونکہ انہیں اسلام کی تعبیر و تشریح کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ ملائیت کی اس اجارہ داری پر جب بھی کسی گوشے سے زد پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو مذہبی پیشوائیت تمام اختلافات بھلا کر یک زبان ہو کر چیخنے' چلانے لگتی ہے اور فریاد کناں ہو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے۔

دیکھنا' لینا' پکڑنا' دوڑنا' جانے نہ پائے
لے چلا میری شکیبائی وہ کافر لے چلا

انہیں معلوم ہے کہ اگر مملکت کے قوانین اسی طرح قرآن کریم سے اخذ کرنے کی رسم چل نکلی تو معاشرے کو مُلّا کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جب اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تو پھر اس کی جارہ داری بھی ختم ہو جائے گی اور یوں اس کا کسبِ معاش کا ذریعہ بھی ہاتھ سے چھن جائے گا۔ چنانچہ اپنی اس اجارہ داری کا تسلسل برقرار رکھنے کے لئے عامتہ المسلمین اور اپنے ارادت مندوں میں یہ تصور عام کر دیا گیا ہے کہ دین کی تشریح و تعبیر کا حق صرف

اور صرف مُلّا کو حاصل ہے۔

مورخہ ۲۳ دسمبر ۲۰۰۶ء کو جناب خورشید ندیم کا ایک مضمون روزنامہ جنگ راولپنڈی کی اشاعت میں شائع ہوا' جس کا عنوان تھا ''اسلام کی تعبیر کا اختیار''۔ اس میں پہلے یہ اصولی سوال اٹھایا گیا ہے کہ اسلام میں دین کی تشریح وتعبیر کا حق کسے ہے۔ ارشاد ہے:

''(یہ) ایک سنجیدہ مسئلہ ہے کہ اسلام کے بارے میں کسے اِذنِ کلام ہونا چاہئے یا کون یہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسلام کے باب میں اس کا فرمایا ہوا مستند شمار ہو''۔

اس کے بعد موصوف اسلام میں مذہبی پیشوائیت یا پاپائیت (Priesthood) کا جواز ثابت کرنے کے لئے دیکھئے کونسی دلیل لے کر آئے ہیں:

''اگر کسی نے دشتِ ادب کی کبھی سیاحی نہ کی ہو' اسالیبِ کلام کے تنوع سے واقف نہ ہو تو ہم اس کا یہ حق تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ وہ کسی شعر کے حسن و قبح کا فیصلہ کرے۔ اگر کوئی طب سے واقف نہ ہو تو کوئی ہوش مند علاج کے لئے اس کے پاس نہیں جاتا۔ اس اصول پر کیا دین کے معاملے میں کسی ایسے شخص کی بات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جو قرآن سے واقف ہے نہ سنت سے۔ حدیث کو جانتا ہے نہ فقہ کو؟''۔

اب غور کیجئے' موصوف نے محض لفاظی کے زور پر ایک غلط تشبیہہ کو کس طرح دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بادی النظر میں یہ دلیل بڑی مسکت اور وزنی معلوم ہوتی ہے اور سادہ لوح مسلمان بہت جلد اس دلیل سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس دلیل پر' آیئے' ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس دلیل میں نقدِ ادب اور طِب کی مثال کو دین اسلام پر منطبق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی شعر کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنا ایک فن (Art) ہے' اسی طرح طِب بھی ایک فنی پیشہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک نقادِ ادب یا طبیب (Doctor) بننے کے لئے ان خاص فنون کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

یہاں پر خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دین بھی اسی قسم کی فنی چیز ہے جس کے لئے کسی خاص قسم کے علوم یا ٹیکنیکل تعلیم کی ضرورت ہے؟ کیا دین بھی شاعری یا طب کی طرح ایک فن ہے؟ اگر اس کا جواب نہ میں ہے تو موصوف کے دلائل کے اہرام خود بخود زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ اگر اس سوال کا جواب ہاں میں ہو تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ سابقون الاولون نے وہ کونسی فنی تعلیم حاصل کی تھی جس کے بعد وہ دین کے معاملہ میں بات کرنے کے قابل ہو گئے تھے؟

موصوف نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ دراصل برسوں پہلے ایک ''مزاج شناس رسول'' نے بھی اسلام میں

پاپائیت کو سندِ جواز فراہم کرنے کے لئے پیش کی تھیں۔ خورشید ندیم صاحب نے انہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے' برسوں پہلے ''مزاج شناس رسول'' نے کیا دلائل دیے تھے:

''حال ہی میں ایک نرالا انداز فکر پیدا ہوا ہے کہ اسلام میں پریسٹ ھُڈ نہیں ہے۔ قرآن اور سنت اور شریعت پر کوئی مُلّا کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو۔ جس طرح وہ تعبیر احکام اور اجتہاد و استنباط کرنے کا حق رکھتا ہے' اسی طرح ہم بھی یہی حق رکھتے ہیں۔ اگر جہالت کی طغیانی کو یوں بڑھنے دیا گیا تو بعید نہیں کہ کل کوئی اٹھ کر کہے کہ اسلام میں ''وکیل ھڈ'' نہیں ہے اس لیے ہر شخص قانون پر بولے گا چاہے اس نے قانون کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو اور پرسوں کوئی دوسرے صاحب اٹھیں اور فرمائیں کہ اسلام میں ''انجینئر ھڈ'' نہیں ہے اس لیے ہم بھی انجینئرنگ پر کلام کریں گے چاہے ہم اس فن کی الف ب سے بھی واقف نہ ہوں اور پھر کوئی تیسرے صاحب اسلام میں ڈاکٹر ھڈ کا انکار کر کے مریضوں کا علاج کرنے کھڑے ہو جائیں بغیر اس کے کہ ان کو علمِ طب کی ہوا بھی لگی ہو۔'' (ماہنامہ ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۵۲ء)۔

ہم بار دگر عرض کریں گے کہ وکالت' انجینئری یا ڈاکٹری فنی پیشے ہیں۔ یہ بات تو خود مودودی صاحب کو بھی تسلیم ہے' جب انہوں نے کہا کہ ''اس فن کی الف ب سے بھی واقف نہ ہوں'' کہ وکالت' انجینئرنگ اور ڈاکٹری کا تعلق فنون سے ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وکیل' انجینئر یا ڈاکٹر بننے کے لئے ان خاص فنون کا علم ضروری ہے۔ اس کے برعکس' دین کوئی فن یا فنی پیشہ (Technical Profession) نہیں ہے۔ پیغمبر صلعم کے ساتھیوں' سابقون الاولون' نے ایسی کوئی ٹیکنیکل تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ انہوں نے ان اٹھارہ علوم میں سے کسی ایک کی بھی تحصیل نہیں کی تھی جو آج ہمارے مذہبی مدرسوں کے نصاب کا حصہ ہیں اور جس کے بعد ایک طالب علم کو ''عالم'' بننے کی سند عطا کر دی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی حیثیت بھی ایک فنی پیشے کی سی رہ جاتی ہے اور یہ مُلّا کے لئے کسبِ معاش کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے وکالت' انجینئری یا طب کو پیشے کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ دراصل' مذہب کو فن یا فنی چیز بنانے کے لئے مُلّا نے خود ہی یہ اٹھارہ علوم وضع کیے اور اس کے بعد اعلان کر دیا کہ ان علوم کے مجموعے کا نام دین ہے۔ کیا قرآن میں کہیں ایک جگہ بھی لکھا ہے کہ جب تک یہ اٹھارہ علوم نہ پڑھے جائیں' قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا؟ دین

کے متعلق یہ بنیادی تصور ہی باطل ہے فلہٰذا اس غلط بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت' خواہ وہ آج خورشید ندیم صاحب نے اٹھائی ہو یا برسوں پہلے مودودی مرحوم نے اٹھائی ہو' بناء علی الفاسد ہے۔ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے' قرآن کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ یہ ہمارا ہی نہیں بلکہ خود قرآن کا دعویٰ ہے' ارشاد ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (۵۴/۱۷)۔

ہم نے ہدایت و رہنمائی کے لئے قرآن کو آسان بنا دیا ہے۔

لیکن مُلّا کا کہنا یہ ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) مشکل کتاب ہے' اس کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد موصوف نے ایک خاص مقصد کے لئے چند شخصیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ طلوع اسلام کے صفحات میں عام طور پر شخصیات کو Discuss نہیں کیا جاتا مگر یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اس سے صرفِ نظر کرنا مشکل ہے۔ پہلے' موصوف نے صدر مملکت کا ایک بیان درج کیا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ:

''جو لوگ حقوقِ نسواں کے قانون پر تنقید کر رہے ہیں' وہ اسلام سے بے خبر ہیں''۔

پھر موصوف نے اس بیان پر یوں تنقید فرمائی ہے:

''جو لوگ آج تحفظِ حقوقِ نسواں قانون پر نقد کر رہے ہیں' ان کے بارے میں فی الجملہ یہ کہنا کہ وہ دین سے بے خبر ہیں' واقعہ یہ ہے کہ دین سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اگر مولانا تقی عثمانی دین سے بے خبر ہیں تو پھر باخبر کون ہوگا۔ وہ جس باپ کے بیٹے ہیں وہ دین کے معاملے میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ مفتی محمد شفیع اس ملت کے لئے اپنے تفقہ فی الدین اور تقویٰ دونوں اعتبارات سے سرمایہ تھے۔ مولانا تقی عثمانی نے ان کے آغوشِ تربیت میں ایک عمر گذاری ہے اور کہتے ہیں کہ جہاں سے دریا ایک بار گذر جائے' وہ زمین مدتوں نم رہتی ہے۔ پھر انہوں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے' قرآن وسنت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے طویل عرصہ مشقت اٹھائی ہے''۔

قارئین کرام! دینِ اسلام میں قرآنِ کریم ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ موصوف اسے نظر انداز کر کے ایک خاص فرقے کے بزرگوار کو دین میں سند کا درجہ دے رہے ہیں۔ یہ دعویٰ تو شاید ان بزرگوار یا ان کے پسرِ محترم کو بھی نہ ہو مگر صاحبِ مضمون خواہی نخواہی انہیں دین میں حجت قرار دے رہے ہیں۔ جس خاص مقصد کے لئے یہ سب اہتمام کیا

جا رہا ہے وہ آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آشکار ہو جائے گا۔ موصوف نے مذکورہ بزرگوں کے تفقہ فی الدین اور فہمِ قرآن وسنت کو سرمایہ ملت قرار دیا ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر مذکورہ بزرگواروں کی تحریروں سے تفقہ فی الدین اور فہمِ قرآن کا ایک ایک نمونہ قارئینِ طلوع اسلام کے لئے یہاں درج کیا جائے۔ مُشتِ نمونہ از خروارے' کے تحت یہاں مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے پسرِ محترم جناب تقی عثمانی صاحب کے فتاویٰ میں سے ایک ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے اور وہ بھی بلا تبصرہ تاکہ ان کے تفقہ فی الدین اور فہم قرآن کا اندازہ قارئین خود کرسکیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب سے سوال کیا گیا کہ لاؤڈ سپیکر کا استعمال حلال ہے یا حرام۔ مفتی صاحب نے فتویٰ دیا کہ:

''لاؤڈ سپیکر کا استعمال قطعاً حرام ہے۔'' (رسالہ البدائع مفیدہ فی حکم الصنائع جدیدہ' ص ۲۰' شائع کردہ دارالعلوم دیوبند)۔

اب ظاہر ہے کہ مفتی صاحب نے یہ فتویٰ یونہی بیٹھے بٹھائے تو نہیں دیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ ''تحقیق'' کی تھی۔ ان کی اس تحقیق سے معلوم پڑتا ہے کہ شریعت کے ماخذ محض وہی نہیں ہیں جو عام طور پر معروف ہیں۔

عام طور پر شریعت کے چار ماخذ بتائے جاتے ہیں یعنی قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس۔ مگر مفتی صاحب کے اس 'تفقہ فی الدین' کا ماخذ کیا تھا' سنئے اور سر دُھنئے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ انہوں نے الیگزنڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر جناب برج نندن لال صاحب سے لاؤڈ سپیکر کی ماہیت کے بارے میں دریافت کیا تو برج نندن لال صاحب نے فرمایا:

''برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے' اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔'' (بحوالہ ایضاً)۔

اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب کے فرزندِ دلبند جناب تقی عثمانی صاحب سے کسی نے سوال پوچھا کہ کیا علاج وغیرہ کی غرض سے قرآنِ کریم کی سورۂ فاتحہ کو خون یا پیشاب سے (معاذ اللہ) لکھنا جائز ہے؟ مفتی تقی عثمانی صاحب نے جو جواب دیا' ہم اس بات کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے۔ ان کا یہ جواب ان کی متنازعہ ترین تصنیف ''فقہی مقالات ۲۰۰۴ء'' کی چوتھی جلد کے پہلے ایڈیشن میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ ''ضربِ حق'' کراچی کے مطابق مفتی تقی عثمانی ابن مفتی شفیع صاحب نے اس فتوے میں' علاج کی غرض سے:

''قرآن مجید کی سورۂ فاتحہ کو پیشاب سے لکھنے کی اجازت کو فقہی طریقے سے ثابت کیا ہے''۔ (بحوالہ 'ضرب حق' کراچی' جلد ۸' شمارہ ۷' اکتوبر ۲۰۰۴ء)۔

یہاں پر ہم قارئین کے ذوق لطیف سے انتہائی معذرت کے ساتھ عرض پرداز ہیں کہ ہمیں ایسی خرافات درج کرنا پڑ رہی ہیں جو ان کی طبعِ سلیم کے لئے یقیناً ناگواری کا باعث ہیں۔ مگر کیا کیجئے' اس کے بغیر بات واضح نہیں کی جاسکتی کہ ؎

بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

خورشید ندیم صاحب نے جو ان بزرگواروں کو دین میں سند کا درجہ عطا کیا ہے' جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے' اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ مذکورہ بزرگواروں کا تعلق دوسرے فرقے سے ہے' جو مذہب کی روایتی تعبیر کا علمبردار ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ ہمارے صاحبانِ جُبّہ و دستار شریعت کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جس نے ان کی طرح کسی مدرسے میں آٹھ دس سال لگا کر اٹھارہ علوم میں مہارت نہ پیدا کی ہو۔ صاحبِ مضمون کا تعلق اہل ''اشراق'' سے ہے۔ ان کے استاد صاحب نے دینی تعلیم چونکہ روایتی طریقے سے حاصل نہیں کی ہے اس لیے صاحبانِ جُبّہ و دستار صاحبِ مضمون کے استادِ گرامی کو نہ تو عالمِ دین سمجھتے ہیں نہ ہی ان کو معاملاتِ شریعت میں کلام کرنے کا مجاز سمجھتے ہیں۔ صاحب مضمون نے مذکورہ بزرگواروں کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے محض اس لئے ملا دیے ہیں تاکہ بدلے میں وہ صاحب مضمون کے استادگرامی کا موقف بھی کھلے دل سے سنیں اور انہیں بھی معاملاتِ شریعت میں بولنے کا مجاز سمجھیں' گویا یہ ؎

مَن تُرا حاجی بگویَم تو مرا قاضی بگو

والا معاملہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' قرآن کی تفہیم پر کسی خاص گروہ یا طبقہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس لئے' اس بات سے تو اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں آدمی بڑا عالم و فاضل ہے' دین کے معاملے میں اس کی بات بھی سنی جانی چاہئے۔ مگر یہ کہ فلاں آدمی اب دین میں سند ہے یا فلاں کا تفقہ فی الدین سرمایۂ ملت ہے وغیرہ۔ یہ سیدھی سیدھی پاپائیت و برہمنیت ہے' جس کی اسلام جیسے دین میں کوئی گنجائش' آنکھیں بند کیے بغیر نہیں نکالی جاسکتی۔

اس کے بعد موصوف یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا مذہبی مدرسوں سے فارغ التحصیل حضرات ہی تنہا یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ دین کے معاملات پر کلام کریں؟ ان کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا؟ پھر خود ہی موصوف اس سوال کا جواب دیتے ہیں اور یہی وہ بات تھی جس کے لئے اتنی لمبی تمہید باندھی گئی تھی۔ فرماتے ہیں:

> ''مولانا تقی عثمانی یا دوسرے علماء کا اگر یہ استحقاق ثابت ہے تو تفقہ فی الدین کی وجہ سے۔ اب یہ صلاحیت اگر کسی دوسرے میں موجود ہے تو وہ بھی اسی طرح یہ حق رکھتا ہے کہ دین کے معاملے میں کلام کرے اور اس کو پوری توجہ سے سنا جائے۔ اسی پیمانے پر ڈاکٹر خالد مسعود' جاوید احمد صاحب

غامدی' پروفیسر خورشید احمد اور ڈاکٹر محمود احمد غازی جیسے بے شمار صاحبان علم کا یہ حق ثابت ہے کہ وہ دینی مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ان سب حضرات کا فہم دین ہر شک وشبے سے بالاتر ہے۔''

موصوف بہ الفاظِ دیگر روایتی مذہبی پیشواؤں سے یہ کہنا چاہتے ہیں ہم آپ کی سیادت تسلیم کرتے ہیں' آپ بھی بدلے میں ہمارے استادِ گرامی کی سیادت تسلیم کر لیجئے۔ پھر وہ ڈاکٹر خالد مسعود کی مثال دیتے ہوئے اپنے استادِ گرامی جناب جاوید غامدی صاحب کے کمالات و فضائل کا ذکر کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

''اگرچہ میک گل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ہونا ہی کسی کو صاحبِ علم ثابت کرنے کے لئے کافی ہے لیکن اسلامی فقہ' امام شاطبی کے نظریہ مقاصد اور علامہ اقبال کے تصورِ اجتہاد جیسے عالمانہ موضوعات پر ان (ڈاکٹر خالد مسعود) کی فاضلانہ کتابیں اس بات کی شہادت ہیں کہ وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ایک جید عالم ہیں..... اسی طرح جاوید احمد صاحب غامدی کی میزان' برہان اور البیان جیسی کتب علمی دنیا کے معجزات ہیں۔ وہ محض ایک فرد نہیں پورا دبستان ہیں۔ تیس پینتیس برس سے قرآن اور اسلامی علوم ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔''

کہتے ہیں کہ پیر خود نہیں اڑا کرتے بلکہ یہ ان کے مرید ہوتے ہیں جو انہیں آسمان کی بلندیوں میں اڑاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی انہیں مرنے نہیں دیتے۔ ؎

پیراں نمی پرند' مریداں پراندند

یقین نہ آئے تو کسی بھی بزرگ کے ''ملفوظات'' کا مطالعہ کیجئے۔ ان کے مرید خاص کے لکھے ہوئے عظیم الشان اور حیران کن کمالات آپ کو ورطۂ حیرت میں ڈبو دیں گے۔ جاوید احمد غامدی صاحب کی کتابوں میزان اور برہان کا' راقم الحروف نے بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے۔ البیان کے چند حصے دیکھے ہیں۔ ان پر راقم کے ایک مضمون کی چار قسطیں' جس کا عنوان ہے ''شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرھا''۔ طلوع اسلام کی دسمبر ۲۰۰۶ء اور جنوری' مئی اور جون ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں شائع ہو چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تلون اور تضاد بیانی کا نام معجزہ رکھ دیا جائے تو بلا شبہ مذکورہ کتابیں جاوید احمد غامدی صاحب کا علمی معجزہ ہیں۔ اپنے مضمون کے آخر میں موصوف صاف صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

''اسلام کیا ہے؟ یہ بتانے کا حق ہر کسی کو نہیں۔ اس معاملے میں اس کی بات توجہ کی مستحق ہے جس کے علم وفضل کی کوئی گواہی ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ گواہی ضروری نہیں کہ کسی دینی مدرسے کی سند ہو بلکہ یہ کوئی کتاب یا کوئی دوسرا علمی کارنامہ بھی ہو سکتی ہے۔''

یعنی موصوف کے نزدیک دین کی تشریح وتعبیر کا حق ہر کسی کے

پاس نہیں بلکہ صرف اس کے پاس ہے جس کے پاس کسی دینی مدرسے کی سند ہو یا پھر اسے یہ حق حاصل ہے جس نے کوئی کتاب لکھی ہو یا کوئی اور علمی کارنامہ کیا ہو۔ یہی وہ پاپائیت ہے جسے صدیوں سے مروجہ اسلام میں رائج کر دیا گیا ہے۔ پہلے صرف اٹھارہ علوم کے حاملین ہی دین کے معاملات میں کلام کرنے کے مجاز سمجھے جاتے تھے' اب' یہ منصب ان لوگوں کے لئے بھی جائز قرار دیا جا رہا ہے' جنہوں نے روایتی اٹھارہ علوم بھلے ہی حاصل نہ کیے ہوں مگر کوئی نہ کوئی کتاب ضرور لکھی ہو یا کوئی دوسرا علمی کارنامہ کیا ہو۔

یہاں پر خلافتِ راشدہ کے درخشندہ دور کی ایک مثال بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ شاہکارِ رسالت جنابِ عمر فاروقؓ کا زمانۂ خلافت ہے۔ آپ مدینہ میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آج کے بعد کوئی مسلمان نکاح کے وقت ایک خاص حد سے زیادہ مہر اپنی منکوحہ کو نہیں دے سکتا۔ مجمع میں سے ایک خاتون اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور خلیفۂ اسلام سے کہتی ہیں کہ آپ مہر کی رقم کی تحدید کس طرح کر سکتے ہیں جبکہ قرآنِ کریم عورتوں کو ڈھیر سا مال ''قنطار'' (۴/۲۰) دینے کی اجازت دیتا ہے؟ اس پر فاروقِ اعظمؓ اپنی رائے سے رجوع کر لیتے ہیں اور خاتون کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ نے بالکل درست کہا۔ (تفسیر القرآن العظیم از حافظ عماد الدین ابن کثیر (۷۷۴ھ) جلد ۱' ص ۴۷۴۔۴۷۳' عربی نسخہ دارِ احیاء التراث العربی' بیروت' لبنان' سنِ اشاعت ۱۴۲۰ھ بمطابق ۲۰۰۰ء)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے یہی احبار و رہبان' منبر و محراب پر لہک لہک کر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ہم صاحبِ مضمون سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس خاتون نے کونسے دینی مدرسے سے اٹھارہ دینی علوم کی سند حاصل کی تھی؟ اس نے کونسی 'معجزہ نما' کتاب تحریر کی تھی؟ کیا اس نے کوئی علمی کارنامہ سرانجام دیا تھا؟ ظاہر ہے کہ مذکورہ شرائط میں سے اس نے کوئی شرط بھی پوری نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس نے کسی 'میک گل یونیورسٹی' سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ سوال یہ ہے کہ پھر سابقون الاولون کی موجودگی میں اس خاتون کو دین کے ایک معاملہ پر بولنے کا حق کیسے حاصل ہو گیا؟ اگر اس خاتون نے از خود یہ حق استعمال کیا تھا تو خلیفۂ دوم نے اسے ٹوکنے کی بجائے کیوں اس کے مؤقف کی تائید کی۔ مزید یہ کہ سابقون الاولون نے اسے یہ حق استعمال کرنے سے کیوں نہیں روکا؟ اگر یہ حق رعایا میں سے ہر ایک کو حاصل تھا تو آج کس اصول کے تحت اس حق پر قدغنیں لگائی جاسکتیں ہیں؟

بات سیدھی سی ہے۔ ہر مومن پر یہ لازم ہے کہ وہ وحیِ خداوندی یعنی قرآنِ کریم کا مطالعہ کرے' اس پر گہری نظر رکھے اور مصافِ زندگی میں قرآن کے بتائے ہوئے احکام سے راہنمائی حاصل کرے۔ بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرے میں عامتہ الناس کی اکثریت قرآنِ کریم کی حقیقی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مُلّا کو شرعی معاملات

پر اجارہ داری حاصل ہو چکی ہے اور موصوف جیسے قلمکاروں کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ مُلّا کو امت کی گردن پر سوار کریں۔ نبی اکرم ﷺ کو اپنے معاملات سلجھانے کے لئے قرآن نے مشاورت کا حکم دیا ہے: ''وشاورھم فی الامر'' (اے نبیؐ) اپنے رفقا سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔ پھر پوری امت کو مشورہ کا حکم دیتے ہوئے قرآن نے کہا کہ: ''وامرھم شوریٰ بینھم'' ان کے معاملات بھی باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔

اس مشاورت کی کوئی حدود نہیں کھینچی گئیں۔ اسے ملت کے لئے عام کر دیا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ لوگوں سے اہم معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ مشہور مصری مؤرخ محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

''نبی اکرم ﷺ نے اعلانِ نماز کے لئے صحابہ سے مشورہ چاہا۔ کچھ لوگوں نے کہا ''آگ''۔ کچھ نے کہا ''بگل'' اور کچھ بولے ''سنکھ''۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں' آخر کار اذان پر فیصلہ ہوا۔ جنگ کے لئے روانہ ہوتے وقت رسول اللہ ﷺ صحابہ سے مشورہ فرماتے تھے کہ کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ غزوۂ احد میں آپ نے ان سے رائے طلب کی کہ مدینہ میں قلعہ بند ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا مدینہ سے باہر نکل کر۔ صلح حدیبیہ اور دوسرے غزوات میں بھی سرورِ کونین ﷺ کا یہی طرزِ عمل رہا۔'' (عمر فاروقِ اعظمؓ۔ از محمد حسین ہیکل' ص۔۶۷۲' ترجمہ حبیب اشعر' مکتبۂ جدید (میکلوڈ روڈ) لاہور' سالِ اشاعت ۱۹۶۱ء)۔

دیکھئے' یہاں نبیِ اکرم ﷺ ایک ایسے معاملے میں بھی مشاورت فرما رہے ہیں جسے عام طور پر خالص شرعی معاملہ سمجھا جاتا ہے' یعنی اذان۔ آپ اسی ایک واقعہ سے باقی باتوں پر قیاس کر لیجئے۔

دین انسانی زندگی کے روزمرہ معاملات سے بحث کرتا ہے اور روزمرہ کے معاملات فنی علوم کے محتاج نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ ان معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کیا کرو۔ قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ یہ مشورہ ان لوگوں سے لیا کرو جن کی پیٹھ پر ان اٹھارہ علوم کی کتابوں کے پُشتارے لدے ہوئے ہوں یا جنہوں نے معجزہ نما کتابیں لکھی ہوں یا پھر جنہوں نے کوئی علمی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ قرآن نے تو مشاورت کو عام کر دیا مگر مُلّا نے اسے اپنے گروہ تک محدود کر دیا۔ اسی کو عرفِ عام میں پاپائیت کہتے ہیں۔ اس کی نہ اسلام میں گنجائش ہے اور نہ ہی عقل و فکر رکھنے والی قوم کو ضرورت۔ قوم کی پارلیمنٹ (مجلس مشاورت) ملت کے عام نمائندوں پر مشتمل ہو گی نہ کہ ٹیکنیکل علوم کے ماہرین پر۔ یہی مسلک قرآن نے تجویز کیا تھا اور اسی کو دنیا کی باقی قوموں نے بھی اپنایا ہوا ہے۔ یہ ہے فرق دین میں اور نقدِ ادب اور طب میں۔ نقدِ ادب اور طب جیسے فنون کی مثال کو دین پر منطبق کرنا ایک منطقی التباس سے زیادہ کچھ نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

درود کا دینی مفہوم

قرآن کریم حیات اجتماعی کا داعی ہے اور حیات انفرادی کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم میں خطاب ہمیشہ جمع کے صیغے میں یاایھا الذین آمنوا کہہ کر ہی کیا گیا ہے۔ قوانین و احکام بھی اجتماعی طور پر مخاطب کر کے ہی دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ دعائیں بھی اجتماعی ہیں ہر شخص کی الگ الگ دعا نہیں ہے۔ اجتماعیت کی یہ خصوصیت دین میں ہوتی ہے۔ مذہب میں اجتماعیت نہیں ہوتی۔ مذہب میں ہر فرد کی اپنی نجات پیش نظر ہوتی ہے اور اس تصور کے ماتحت وہ خدا سے اپنا ذاتی تعلق قائم کرتا ہے۔ وہ جس قدر علائق دنیاوی سے آزاد ہوگا، اسی قدر خدا کے قریب ہوگا۔ چنانچہ وہ پہلے دنیا کو ترک کرتا ہے ۔ ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترکِ ترک پر عمل کرتا ہے۔ وہ کسی حجرہ یا زاویہ میں گوشہ نشین ہو جاتا ہے اور دنیا کے کام کاج دنیا والوں کے سپرد کر دیتا ہے اور خود پرستش خداوندی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ لیکن دین کی صورت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ دنیا کے معاملات و تنازعات کو وحی الٰہی کے مطابق طے کرنا دین ہے۔ دین کے لئے معاشرہ، اور وہ بھی ایسا معاشرہ کہ جس میں قوانین وحی الٰہی کا نفاذ ہو سکے ضروری و لابدی ہوتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کے اندر رہ کر افراد معاشرہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے یعنی تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ تزکیہ نفس تجرد گاہوں میں نہیں ہو سکتا کیونکہ وحی کے سارے احکام اجتماعی ہیں اس لئے زوایا اور گوشوں میں ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں تصوف کے زیر اثر جو لوگ تنہا حظیروں اور حجروں میں تزکیہ نفس کرتے ہیں، حقیقت میں وہ تزکیہ نفس نہیں ہوتا۔ وہ تو نفس کو مارتے ہیں۔ تزکیہ نفس کوئی ایسی چیز نہیں جس کو آپ خود محسوس نہ کر سکیں۔ معاشرہ کے ہر عمل کے خلاف آپ کا Sponteneous ردِعمل جس قدر صفات خداوندی کے مطابق ہوگا اسی قدر آپ کا تزکیہ نفس ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہی عمل کا ردعمل ایک شریف آدمی کا اور ہوتا ہے اور ایک کمزور سیرت کا اور ہوگا۔ روزمرہ کے ردعمل سے آدمی خود اپنی سیرت کی پختگی، تزکیہ نفس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ حجروں، حظیروں، گوشوں، کونوں میں بیٹھ کر، یہ صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کو تزکیہ نفس سے کیا علاقہ؟

قرآنِ کریم چونکہ انفرادی پرستش کا قائل نہیں ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک اجتماعی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہے۔ اسلامی حکومت چونکہ قرآنی قوانین جاری کرتی ہے اس لئے اس کی اطاعت قرآنی قوانین کی اطاعت اور اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ چونکہ اسلام میں انفرادی عبادت کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس لئے صلوٰۃ کا قیام بھی اجتماعی ہے۔ اپنے تمام معاملات کو وحیِ الٰہی کے تابع کرنا اقامتِ صلوٰۃ ہے اور قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلنا صلوٰۃ کا قائم کرنا ہے۔ ہمارے ہاں جو اجتماعات صلوٰۃ (نماز) ہوتے ہیں وہ بھی اس نظام کا جزو ہوتے ہیں اور ان سے مقصد اسلامی حکومت کو قائم کرنا اور اس کو دائم رکھنا ہوتا ہے۔ وہ حکومت کے ماتحت' اس کی نگرانی میں ہی قائم ہوتے ہیں۔ محلے کے لوگوں کا چندہ جمع کر کے' ایک مولوی کو مقرر کر کے' اس کے پیچھے نماز پڑھنا' اور اس کو اقامتِ صلوٰۃ سمجھنا' ''حدیث بے خبراں'' ہے۔

ہم مسلمانوں میں جب دین کی اصل صورت نہیں رہی تو ہماری اطاعتِ خداوندی بھی رسوم و پرستش میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ نوافل' وتر' سنتیں' تہجد اور وظائف' درود شریف' سب شروع ہو گئے۔ درود شریف پر ہمارے ہاں بہت زور دیا جاتا ہے اور اس کو بڑی اہمیت و افضلیت دی جاتی ہے۔ ہر وظیفے سے پیشتر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھا جاتا ہے۔ نعت خاں حضرات بھی اعلان کرتے ہیں۔

پڑھو درود پڑھو مومنو' درود پڑھو
درود سے کبھی غافل نہ ہو' درود پڑھو

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

ہر مرض کی دوا ہے صَلِّ علیٰ محمد

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جو درود شریف ہم پڑھتے ہیں اور جو ہمارے ہاں مروّج ہے۔ اس کی کوئی سند قرآنِ کریم سے نہیں ملتی۔ سورۂ احزاب کی آیہ نمبر 56 سے اس کو اخذ کیا جاتا ہے۔ اس آیت کی تشریح تو بعد میں پیشِ خدمتِ عالی ہو گی۔ جو چند سوالات پیدا ہوتے ہیں پہلے ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(1) مروجہ درود کے یہ الفاظ ہیں۔

الھم صلی علی محمد وآل محمد کما صلیت علی ابراہیم وآل ابراہیم' انک حمید مجید۔

اے اللہ تو محمد و آل محمد پر رحمت بھیج جس طرح تو نے ابراہیم و آل ابراہیم پر رحمت بھیجی۔

اس میں خطاب اللہ تعالیٰ سے رحمت بھیجنے کا ہوتا ہے۔ روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ اور ملائکہ خود بھی یہی درود پڑھتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام درود شریف کے فضائل میں یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ خود بھی ہمارے عمل میں شریک ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے خداوند متعال' اس خالقِ مطلق' اس ذاتِ

بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ پر صلوٰۃ یعنی رحمت بھیجے۔ اور وہ ہماری دعا قبول فرما کر حضور پر صلوٰۃ بھیج دیتا ہے۔ لیکن یہی خدا تعالیٰ' ہمارا مالک و خالق وہ ذاتِ بزرگ و برتر جب یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ یا اللہ تو محمد ﷺ پر صلوٰۃ بھیج تو وہ کس خدا سے یہ دعا کرتا ہے اس کا تو کوئی اور خدا نہیں ہے یہ بات غور کی متقاضی ہے۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں جب اپنا مشن شروع کیا تو لوگ آپ کے مشن کی صداقت سے متاثر ہو کر مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن جو لوگ اسلام کے خلاف اور اس کے دشمن تھے وہ تو حضور ﷺ کی ایک ایک بات کو تنقید کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جو باتیں ان کے ہاتھ آ جاتیں وہ ان کو اچھالتے تھے۔ جب حضور ﷺ اپنی زندگی میں نماز کے دوران یہ درود شریف پڑھتے ہوں گے اور اپنے اور اپنی اولاد پر درود بھیجتے ہوں گے تو اس سے مخالفین کو بڑا اعتراض ہاتھ آتا ہو گا کہ (معاذ اللہ) حضور ﷺ جو کچھ پیش کر رہے تھے وہ صرف اپنے کو اور اپنی اولاد کو Project کر رہے تھے۔ حالانکہ اس آیت سے قبل آیت نمبر 56 میں ہے کہ:

اللہ و ملائکہ مومنین پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

اس آیۂ کریمہ نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ بہرحال یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ جیسی بلند ترین سیرت کا انسان اس طرح اپنی اور اپنی اولاد کی تعریف کو جزو دین و جزو عبادت بنا سکتا ہے۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ فرض نمازوں کے بعد ہم سنتیں رسول اللہ ﷺ کے نام کی پڑھتے ہیں تو حضور ﷺ فرض نماز کے بعد جب سنتیں پڑھتے تھے تو وہ کس کے نام کی ہوتی تھیں۔

ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ آل ابراہیم تو سارے یہودی ہیں ان پر درود بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر برسبیل تنزل آپ مولوی حضرات کے درود کو درست تسلیم کر لیں تو اس آیۂ کریمہ میں تو آل کا ذکر دور دور تک بھی کہیں نہیں ہے۔ ہمارے ہاں آل کے علاوہ ازواج' اصحاب' ذریت کا بھی اضافہ کر دیتے ہیں۔ جب قرآن سے سند کی ضرورت ہی نہیں رہی تو آپ جس کا جی چاہے اضافہ کر سکتے ہیں۔ جب آل کا اضافہ بے سند ہے' تو ان کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

ارشاد عالی ہوتا ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيماً o (33/56)۔

اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر اے ایمان والو رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے تفسیر عثمانی میں فرمایا:

''حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سلام کا طریقہ تو

ہمیں معلوم ہوا (یعنی نماز کے تشہد میں جو پڑھا جاتا ہے السلام علیک ایھا النبی و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ) صلوٰۃ کا طریقہ بھی ارشاد فرما دیجئے جو نماز میں پڑھا کریں۔ آپ ﷺ نے یہ درود شریف تلقین کیا ''اللھم صل علی محمد وآل محمد کما صلیت علی ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم انک حمید مجید۔'' (اقتباس ختم ہوا)۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے جو صلوٰۃ تحریر کی ہے ہمارے ہاں صرف اس کا پہلا حصہ درود شمار ہوتا ہے دوسرا حصہ اللھم بارک سے آخر تک جو ہے وہ درود میں شامل نہیں کیا جاتا۔ معلوم نہیں کہ ہمارے علماء کرام اس کی کیا توجیہہ فرماتے ہیں۔ مختلف تفاسیر میں کچھ تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ تقریباً سب نے یہی تحریر فرمایا ہے کہ صحابہؓ کے استفسار پر حضور ﷺ نے صلوٰۃ کے متعلق یہی الفاظ بیان فرمائے۔

تفقّہ فی القرآن کے لئے تصریفِ آیات کے قرآنی اسلوب کو چھوڑ کے کوئی اور طریقہ تفقہ اختیار کرنے کو قرآن کریم سے فرار قرار دیا گیا ہے (6/46)۔ خود قرآنی ہدایات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کا واحد طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ اسی لئے خود حضور ﷺ کا طریقۂ تدریس بھی یہی تھا کہ آپ تصریفِ آیات ہی سے درس قرآن دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (6/105)۔

اور اے رسول ہم اسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا۔

(اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔ یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا۔ درود شریف کے جو الفاظ حضور ﷺ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ قرآن کی تصریف آیات کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے یہ حضور ﷺ کے کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ اب آپ کے سامنے آیت کی تشریح تصریفِ آیات کے مطابق پیش کی جاتی ہے۔

ارشاد مبارک ہوتا ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (14/1)۔

اے رسول یہ قرآن وہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمہارے پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لاؤ۔

آیۂ کریمہ میں قرآن کریم کا مقصد انسانیت کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لانا بتایا گیا ہے۔ اس آیت سے چند

آیات بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَى بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ(14/5)۔

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاؤ۔

آیت کریمہ نے فرعونی معاشرہ کو ظلمات سے تعبیر کیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ اپنی قوم کو اس ظلمانی معاشرہ سے نکال کر نورانی معاشرہ میں لے آئیں۔ حضرت موسیٰؑ حکم خداوندی کے مطابق اس قوم کو فرعون کی غلامی سے نکال کر وادیٔ سینا میں لے آئے جہاں انہیں پوری پوری آزادی حاصل تھی اور جہاں انہوں نے بتدریج' آہستہ آہستہ قانون خداوندی کا نفاذ کر کے قوانین خداوندی کے ماتحت زندگی گذارنی شروع کر دی۔ اس معاشرہ کو قرآن کریم نے نورانی معاشرہ سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے لیکن حضورﷺ کی بعثت ساری انسانیت کے لئے تھی اس لئے ان کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن کی تعلیم کے ذریعے ساری انسانیت کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف' یعنی طاغوتی نظام سے نکال کر قرآنی نظام تک لے آئیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ(33/43)۔

وہ وہی تو ہے جو تم پر درود (رحمت) بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جائے۔

یعنی صلوا علیکم کا نتیجہ ''اخراج عن الظلمات الی النور'' یعنی تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آنا ہے اور آیت نمبر (15/5) جس میں حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ ہے' اس کے پیش نظر عملاً طاغوت کے اندھیرے سے قرآنی حکومت کے نور کی طرف نکل آنا ہے۔

آیت کریمہ (33/56) صلوا علیہ وسلموا تسلیماً میں سلموا تسلیما نے خود صلوا علیہ کی تفسیر کر دی ہے کہ رسول اللہﷺ کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اسی سلموا تسلیماً کی تفسیر (4/65) میں یہ کہہ کر کی ہے کہ تمام مومنین اپنے تمام متنازعہ فیہ امور کے فیصلے رسول اللہﷺ سے کرائیں اور ان کی پوری پوری اطاعت کریں۔ ان دونوں آیات کے ملانے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صلوا علیہ وسلموا تسلیماً کوئی خیالی یا قولی چیز نہیں ہے بلکہ ایک عملی پروگرام ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مومنین رسول اللہﷺ کی پوری پوری اطاعت کریں اور اس طرح تمام تنازعات کے فیصلے رسول اللہﷺ سے کرا کر نظام خداوندی کی اطاعت کر کے' ظلمات سے نکل کر نور کی طرف آ جائیں۔ صلوا علیہ کوئی زبان سے ادا کرنے کے الفاظ نہیں

ہیں بلکہ اس سے مراد نظام خداوندی کو قائم کر کے' رسول اللہ کی پوری پوری اطاعت کرنا ہے۔ اس سے اگلی آیۂ کریمہ نے اس کی پھر وضاحت کر دی جبکہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ(33/57)۔

جو لوگ اللہ و رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔

اس آیت کریمہ کے لفظ یوذون (اذیت دیتے ہیں) کے لفظ نے سلموا تسلیماً کی کھول کر تشریح کر دی کہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایذاء دینے کے مقابلہ میں قرآن سلموا تسلیماً لایا ہے۔ یعنی پوری پوری اطاعت کرنا۔

آیہ کریمہ (33/56) جس سے درود کا مفہوم اخذ کیا جاتا ہے' تصریفِ آیات سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور ملائکہ مومنین کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ ظلمت سے نکل کر نور کی طرف آ جائیں اور اللہ اور ملائکہ کا یہی عمل خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی ہے اور مومنین کو حکم خداوندی ہے کہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہی عمل رکھیں یعنی ان کی نصرت کریں اور اس کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ ان کی پوری پوری اطاعت کریں۔

اس وضاحت کے بعد اب آپ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر ''مفہوم القرآن'' سے ملاحظہ فرمائیں تاکہ آیت کا مفہوم بالکل صاف ہو جائے۔

(ان قوانین کی اطاعت سے تمہیں خدا کی نصرت اور اس کی کائناتی قوتوں کی تائید حاصل رہے گی 33/43) یہی تائید و نصرت' تمہارے نظام کی مرکزی شخصیت' خود رسول کو بھی حاصل ہے۔ لیکن تم اس اطمینان میں نہ رہو کہ جب خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت تمہارے رسول کے ساتھ شامل ہے تو تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے عمل پیہم سے' رسول کے مشن کی تقویت کا موجب اور اس کے دست و بازو بنو اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاؤ' اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ دل کے جھکاؤ کے ساتھ اس کی پوری پوری اطاعت کرو (4/65, 7/157, 33/43)۔

جیسا کہ اس سے پیشتر کئی مرتبہ تحریر کیا جا چکا ہے' رسول اللہ ﷺ کی اطاعت صرف اسلامی نظام میں ہو سکتی ہے' اسلامی نظام کے بغیر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ آیۂ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم ہے اور اس پر شدید اصرار ہے۔ جو صرف اسلامی نظام میں ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں درود شریف کے لئے اسلامی نظام کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ مذہب میں تو درود چند الفاظ کا دہرانا ہے۔ لیکن وہ آیت جس سے درود کو اخذ کیا جاتا ہے۔

اس میں درود کی کوئی گنجائش نہیں بنتی بلکہ اس آیت میں حضورﷺ کی اطاعت پر اصرار ہے اور وہ بھی اسلامی نظام کے اندر۔

ہم مسلمان آج جس مصیبت میں گرفتار ہیں اور تمام عملی پروگراموں کو چھوڑ کر محض زبانی' کلامی رسوم ادا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ ہمارے سامنے نہ تو قرآنِ کریم کا پیغام اپنی اصل صورت میں ہوتا ہے اور نہ ہی ہم مروجہ رسوم کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح باقی رہے گا اور ہماری حالت اسی طرح رہے گی جب تک کہ ہمارے سامنے قرآن خالص نہیں آتا۔ اور جب تک ہم غیر قرآنی نظریات و رسوم کو چھوڑ نہیں دیتے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(چوہدری محمد آفتاب عروج)

اِنّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وَاِنّا لَہُ لَحٰفِظُوْنَ

کچھ عرصہ پیشتر دارلعلم نئی دہلی ہندوستان سے ایک کتاب بعنوان .....امت کا بحران .....اوراس کے ذیلی عنوان .....تفکیر' تدبیر' تعمیل .....موصول ہوئی۔ جس کے مصنف محترم اسرار عالم صاحب ہیں۔ میں نے کتاب کا نہائت ہی انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد جو حاصل مطالعہ سامنے آیا وہ یہ کہ کتاب کے مصنف نے قرآن کریم و احادیث اور تاریخ اسلام پر بہت سے سوالات لا کھڑے کیے ہیں۔ اس ضمن میں کسی حد تک تھوڑی بہت معلومات پہلے سے بھی تھیں لیکن محترم اسرار عالم صاحب نے بہت ہی سنجیدہ اور جرات انگیز انکشافات کر کے میرے جیسے کم علم کو نہ صرف ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ بلکہ پریشان بھی کر دیا ہے۔ محترم اسرار عالم صاحب بحرظلمات میں غوطہ زن ہوکر اسکی پاتال سے تاریخ کا متعفن کیچڑ نکال لائے ہیں۔ جس نے قرآن کریم کے اعجاز و حقانیت کو نہ صرف آلودہ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ میرے جیسا کمزور دل انسان تو کانپ کر رہ جاتا ہے۔ جو محترم حضرات تاریخ و روایات کے حوالے سے قرآن کا اعجاز و حقانیت ثابت کرنے پر بضد ہیں انہیں خبر ہو کہ محترم اسرار عالم صاحب نے تاریخ، روایات اور سنت پر تحقیق فرما کر نہ صرف انہیں کالعدم قرار دیدیا ہے بلکہ قرآن کریم کے اعجاز و حقانیت اور اسکی لاریبیت و حفاظت کو بھی مشکوک بنا دیا ہے۔ بلکہ قرآن کا مدعا ہی غائب کر کے جعلی قرآن ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ (امت کا بحران' صفحہ 136 تا 140)

اس ناچیز کم علم کو مزید حیرت یہ ہو رہی ہے کہ قرآن کریم کو جعلی قرار دیئے جانے کی یہ سازش دہلی ہندوستان میں بیٹھ کر ہو رہی ہے۔ یہاں پاکستان کے مختلف اداروں اور افراد کو مفت کتابیں بھیجی جا رہی ہیں اور میرے جیسے کم علم انسانوں کے دلوں میں قرآن کریم کی عظمت اور اس پر ایمان کو متزلزل' ڈانواں ڈول کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور ہمارے محترم و مکرم علماء کرام حضرات جو ہمارے ایمان کو ایسی آلائشوں سے پاک رکھنے کے دعوے دار ہیں وہ چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ ہمارے محترم علماء کرام کو بھی یقیناً معلوم ہے کہ ہماری تاریخ و روایات میں یہ سب رطب و یابس موجود ہے۔

جو محترم اسرار عالم صاحب نے پیش کیا ہے اسی لیے انہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے حالانکہ اس بندہ ناچیز نے

پندرہ علماء کرام کی خدمت اقدس میں اپنے عریضہ کے ساتھ اس کتاب (امت کا بحران) کے مختلف اہم حصوں کی نقول بھی ساتھ بھیجی تھیں دو ایک کے سوا کسی بھی محترم ''عالمِ دین'' نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ اس لیے کہ اب تک تمام اسلامی لٹریچر کتب تاریخ و روایات کو پرکھنے کا کوئی سائنٹفیک معیار مقرر نہیں کیا جا سکا (جو معیار Standard یا کسوٹی اللہ تبارک تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اسے ہم درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے) جس پر دو اور دو چار کی طرح جانچا پرکھا جا سکے۔ اب ہمارے پاس مستند و معتبر معیار ''اسناد و اجماع'' ہے (حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں امت مسلمہ کا اجماع نہیں ہے خود فریبی اور خوش فہمی الگ بات ہے) جو انسانوں کا ایجاد و مرتب کردہ ہے۔ تاریخ و روایات میں انسانوں کو کس قدر حتمیت حاصل ہے وہ محترم اسرار عالم صاحب نے اپنی کتاب میں واضح کر کے رکھ دی ہے کہ اسلامی لٹریچر' کتب تاریخ میں تمام رطب و یابس دستیاب ہے ہم نے کیا صرف یہ ہے کہ تمام دستیاب اسلامی لٹریچر میں لکیریں کھینچ کر اپنی اپنی پسندیدہ تاریخ و روایات کو اجماع و تواتر و تعامل کی سند دیکر اسے پاک و منزہ سمجھ لیا اور اسے دین کا حصہ قرار دیکر قرآن کی مثل بلکہ اس سے بھی بالا تر قرار دے کر سربمہر کر دیا۔ دوسرے حصے کو تلف تو نہیں کیا گیا۔ سائیڈ لائن کر دیا گیا۔ تاکہ بوقت ضرورت اس سے بھی کام لیا جا سکے۔ حالانکہ دونوں قسم کے تاریخ و روایات کے تخلیق کار ایک ہی ہیں۔ ایک حوالہ..... علوم اسلامی اور معاشرہ اسلامی میں سیرت کا اولین اور مستند ماخذ ابن اسحاق اور ابن شہاب زہری جیسے چھپے یہودی (Crypto) ہیں اور امت کی اس سے بڑی بے بسی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس ماخذ سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے نہ استفادہ (امت کا بحران صفحہ 67)۔

موسیٰ علیہ اسلام کی چالیس روزہ غیر حاضری میں قوم بنی اسرائیل سامری کے چنگل میں پھنس کر بچھڑے کی پرستش کرنے لگ گئی تھی چونکہ ہمارے نبی ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اس لیے ہم نے چالیس سال گزر جانے کے بعد سامری کی آغوش میں جا کر اس نظام مرکزیت سے چھٹکارا حاصل کر لیا جو نبی اکرم ﷺ ہمیں دے کر گئے تھے نظام مرکزیت ہی ان کی سنت تھی ہم میں اور بنی اسرائیل میں اعداد کی مماثلت تو ایک ہی ہے۔ بس زمان و مکاں کا فرق ہے۔ قوم بنی اسرائیل کو تو موسیٰ علیہ اسلام جا کر واپس لے آئے تھے اب ہمیں اس نبی المکرّم ﷺ کے عطا کردہ نظام مرکزیت کے دھارے میں واپس کون لائے گا؟

محترم علماء کرام سے اپنی اس جسارت کیلئے معذرت کے بعد عرض ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے لیکر حضرت عثمانؓ تک امت میں مروجہ فرقوں کا وجود نہ تھا۔ صرف امت واحدہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ سے عثمانؓ تک یہی سنت تھی یہی تواتر و اجماع تھا ایک مرکزیت تھی ایک نظام تھا جسے ہم نے چھوڑ دیا' ترک کر دیا۔ اس کے بعد ہم ملوکیت لے آئے تو دشمنان دین و اسلام یہودی جو اللہ و رسول ﷺ کے عطا کردہ دین کو تباہ برباد کرنے کے درپے تھے اور موقع کی تلاش میں تھے' وہ ہم نے انہیں فراہم کر دیا تو انہیں سنہری

موقع دستیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ابن اسحاق ابن شہاب زہری اور انکے ہمنواؤں نے نبی اکرم ﷺ کے سنت مخالف فرقہ ساز تواتر و تعامل اور اجماع تخلیق کر کے امت مسلمہ کو دے دیے۔ ان تخلیق کاروں نے ہم پر یہ پابندی بھی عائد کر رکھی ہے کہ ہمارے اس تخلیق کردہ تواتر و اجماع پر آنکھیں بند کر کے بلا چوں و چرا عمل کرنا ہے اپنی سوچ سمجھ سے کام نہیں لینا۔ اپنے دل و دماغ کو مقفل رکھنا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے۔ اور ان کے کانوں کو بہرا اور انکی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ بھلا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔ (سورۃ محمد 23-24) اب ہم بڑے فخر کے ساتھ ابن اسحاق اور ابن شہاب زہری کے تخلیق کردہ فرقہ ساز مشرکانہ تواتر و تعامل اور اجماع کو اسناد کا تقدس دیکر خلوص نیت کے ساتھ اس کے حق میں دلائل فراہم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے دل میں ذرا سی بھی کسک محسوس نہیں ہو رہی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسکی کوئی سند نہیں اتاری۔ جن چیزوں کو تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہیں (تواتر و تعامل اور اجماع) جو تم اور تمہارے (سلف) باپ دادا نے رکھ لیے ہیں خدا نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ سن رکھو خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے (الخ سورۃ یوسف 40) المر، اے محمد یہ کتاب الٰہی کی آیتیں ہیں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (الرعد 1) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادا کو پایا۔ بھلا اگر چہ شیطان ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف بلاتا ہو تب بھی (سورۃ لقمان 21)۔

مجھ کم علم کو اس بات پر بھی حیرت ہو رہی ہے کہ ہم تاریخ و روایات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرنے کی بجائے قرآن کو آئینہ قرآن سے دیکھنے اور بارگاہ قرآنی میں حاضر ہونے سے کیوں گریزاں ہیں۔ اگر بارگاہ قرآنی سے یہ پوچھ لیا جائے کہ حضور آپ کیسے وجود میں آ گئے؟ آپ کا دعویٰ لاریبیت' اکملیت اور حفاظت کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یونہی شعر کا وزن برابر کرنے کے مصداق جملوں میں الفاظ رکھ دیے ہیں قرآنی ارشادات کے مطابق تو میرے پرودگار اور میرے پیارے نبی ﷺ قرآن مکمل کتاب کی شکل میں جیسا کہ اب ہمارے ہاتھوں میں ہے اپنے دست مبارک سے امت مسلمہ کو دیکر گئے تھے۔ بعد میں عثمان غنیؓ کے دور سے منسوب جو افسانے تراشے گئے ان میں سے ایک افسانہ جمع القرآن کا بھی ہے۔ جسے ابن اسحاق اور ابن شہاب زہری جیسے لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ قرآنی آیات اور سورتیں غائب کر دی گئیں لیکن ان پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ کچھ آیات منسوخ کر دی گئیں جن پر عمل درآمد نہیں کیا جا رہا۔ وہ صرف تلاوت کیلئے ہیں اور کچھ آیات ایسی بھی تھیں جن کو بکریاں کھا گئیں۔ اس کے بعد قرآن کا اکملیت و حفاظت کا دعویٰ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

میرے جیسے کم علم کو قرآن کریم کے مطالعے سے

قرآن کریم کی آیات اور سورتوں کو بذریعہ قلم اور.....اوراق پرلکھ کران کی ترتیب کے ساتھ شیرازہ بندی کر کے کتابی شکل دیکر مومنین کے سینوں میں محفوظ وسربمہر کردینے کی راہنمائی مل سکتی ہے تو علماء کرام جو مجھ سے بہتر اور زیادہ سائنٹفک طریق سے قرآن کو آئینہ قرآن یعنی تصریفِ آیات سے تاریخ و روایات کی بھول بھلیوں میں پڑے بغیرقرآن کی صحت و حفاظت پر قلم کیوں نہیں اٹھاتے؟

اس کتاب (امت کا بحران' تفکیر' تدبیر اور تعمیل) پڑھنے کے بعد جس میں مصنف نے قرآن کریم کو جعلی قرار دینے کی مذموم جسارت کی ہے (امت کا بحران صفحہ 136 تا140)۔اس ناچیز کم علم پر تو کپکپی طاری ہوگئی یہ کمزور و ناتواں اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ سکا۔ غیرت قرآن کے تحت گرتا پڑتا بارگاہ قرآنی میں حاضر ہوا اور نہایت عاجزی سے گریہ زاری کے ساتھ راہنمائی کیلئے فریاد کی تو بارگاہ قرآنی سے جو اعلان و جواب مجھے عطا ہوا اور جو میں نے سمجھا وہ قارئین کی خدمت عالیہ میں پیش ہے۔ ملاحظہ فرمائے گا!

و ما تو فیقی الا باللہ العلی العظیم

اے محمد!اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا..... پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔ سورۃ علق (1-3-4-5) اللہ تعالیٰ اپنی عطاء ربوبیت اور کریمیت کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کو پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں اوراس دائرہ کووسیع کرتے ہوئے ہرانسان کولوح وقلم کے ذریعے لکھنے پڑھنے کی ہدایت وترغیب دے کرعلم سیکھنے اورعلم کی اہمیت پرزوردیا گیا ہے۔

نون!قسم ہے قلم کی اور جو وہ اہل قلم لکھتے ہیں۔ (سورۃ قلم 1) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ و تبارک قلم کے ذریعے کتابت یعنی تحریر کی اہمیت کو اجاگر فرمارہے ہیں اوراس سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ بعثت نبوی سے قبل عرب معاشرہ میں چاہے جتنا کچھ بھی تھا' پڑھنے لکھنے کا رواج تھا اور یہ آیت جلیلہ اس طرف بھی اشارہ کررہی ہے کہ اس وقت جو اہل قلم میسر تھے وہ قرآن کریم کی کتابت بھی کرتے تھے۔چونکہ یہ عمل قانون خداوندی کے عین مطابق اور پسندیدہ تھا اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے بھی بطور شہادت ہماری راہنمائی کے لئے ذکرفرمایا ہے۔

مومنو!جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لئے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کولکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں سے کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسا خدا نے اسے سکھایا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے اور دستاویز لکھ دے۔الخ (البقرۃ۔282) یہاں اللہ تبارک تعالیٰ ایک خاص معاملہ قرض کے لین دین پر ایک اصولی ہدایت فرمارہے ہیں کہ قرض چھوٹا ہو یا بڑا اسے ضبط تحریر میں لے آیا کرو یعنی بعثت رسالت مآب کے وقت لکھنے پڑھنے اور دستاویزات لکھنے لکھانے کا کام ہوتا تھا اللہ تعالیٰ قرض کے علاوہ دوسرے معاملات کو بھی ضبط تحریر میں لانے کا کہہ

کر ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ جو چیز لکھی ہوئی نہ ہو تو اسکی صحت مشکوک ہوتی ہے اور اس کی کوئی ضمانت بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی شہادت استوار ہوسکتی ہے نہ کوئی بات یا کوئی بھی معاملہ شکوک وشبہات سے بالاتر ہوسکتا ہے قرض کا لین دین تو انسانوں کے باہمی معاملہ کی بات ہے۔ قرآن کا معاملہ دین کی بنیاد کا معاملہ ہے اگر چھوٹا یا بڑا قرض دستاویز نہ لکھنے کی بنا پر اللہ کے نزدیک صحت سے دور' شہادت کے لئے نا استوار اور محل شبہ قرار پا سکتا ہے تو قرآن کا نہ لکھا جانا اور محض زبانی نقل پر اکتفا کر لینا کیسے جائز ہوسکتا ہے چنانچہ رسول ﷺ کو پہلی وحی میں قرءات اور قلم کی طرف متوجہ کر دیا گیا اور اس رہنمائی کے بعد نبی اکرم ﷺ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

اور کافر کہتے ہیں یہ قرآن من گھڑت باتیں ہیں جو اس مدعی رسالت نے بنالی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں اس نے خود لکھ لیا ہے پس وہ ان پر پڑھی جاتی ہیں' سنائی جاتی ہیں' صبح وشام (الفرقان 4-5) نزول وحی کے بعد نبی اکرم ﷺ پہلے اس کو خود لکھ لیتے تھے اور پھر بعد میں صحابہ کرامؓ کو بھی (املاء) وحی لکھوا دیا کرتے تھے اور ایسا بالالتزام ہوتا رہتا تھا پھر یہ آیات ایک دوسرے کو پڑھ کر سنائی بھی جاتی تھیں۔

الف لام میم۔ یہ کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں (البقرۃ 1-2) .... بے شک تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور (**کِتٰــب'' مُّبِیــن''**) روشن کتاب آ چکی ہے (سورۃ مائدہ 15)

.... اس لئے کہ خدا نے (اَلْکِتٰبَ بِالْحَقِّ) سچائی کے ساتھ نازل فرمائی (البقرۃ 176) .... اس نے تمہاری طرف (اَلْکِتٰبُ مُفَصَّلاً) واضح المطالب کتاب بھیجی ہے (الانعام 114) **الٓرٰ** یہ بڑی دانائی (اَلْکِتٰبِ الْحَکِیْم) کی کتاب کی آیتیں ہیں (یونس 1) .... اور یہ تو ایک (**اَلْکِتٰب'' عَزِیْز''**) عالی رتبہ کتاب ہے (حم السجدہ 41) دیگر بے شمار مقامات پر قرآن کریم نے اپنے آپ کو کتاب کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ یہاں قرآن کریم نے اپنے آپ کو کتاب کہا ہے۔ کتاب کہتے ہی اس کو ہیں جس کی شیرازہ بندی کی جا چکی ہو۔ قرآن کریم نے مختلف عنوانوں' مختلف صفات کے ساتھ اپنے آپ کو کتاب کہا ہے جو چیز یا تحریر کھجور کے پتوں یا ہڈیوں پر لکھی گئی ہو یا مختلف اشیاء وجگہ پر منتشر حالت میں ہو اس ناچیز کم علم کے مطابق اسے کتاب نہیں کہا جا سکتا اور جس پیغام' ہدایت ورہنمائی کو قیامت تک انسانیت کے لئے ضابطہ حیات مقرر کیا جانا مقصود ہو اسے منتشر حالت میں انسانوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تاریخ وروایات میں جو حشر سامانیاں انسانوں نے برپا کی ہیں وہ محترم اسرار عالم صاحب کی کتاب ''امت کا بحران'' میں عیاں ہیں۔

کہہ دو! اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنالائیں تو اس جیسا نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ (بنی اسرائیل 88) اس کے بعد قرآن میں مختلف جگہوں پر لفظ سورۃ لایا گیا ہے مثلاً **بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ** (البقرۃ 23' یونس 38)

سُوْرَۃ'' (توبہ 64)' ...... سُوْرَۃ'' (محمد 20) ...... سُوْرَۃ'' (النور 1) ...... بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ (الخ ہود 13) ...... کہیں ...... اٰیٰتِ اللّٰہِ (البقرہ 610) ...... اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ (البقرہ 99) ...... اٰیٰت'' مُحْکَمٰت'' (العمران 7) یہاں قرآن کریم نے اپنے آپ کو القرآن کہا ہے اور چیلنج کیا ہے کہ اس جیسا قرآن بنا لاؤ اور قرآن اور کتاب بہت سی صورتوں اور اٰیات کے مجموعہ کا نام ہے۔

تمہیں کیا ہوگیا ہے، کیسی تجویزیں کرتے ہو...... کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں سے یہ پڑھتے ہو...... کیا ان کے پاس بھی علم غیب ہے، جسے وہ لکھ لیتے ہوں؟ (سورۃ قلم 36,37,47) جب مشرکین اپنے عناد پر قائم رہتے ہیں تو قرآن کریم ان سے بطور استعجاب سوال کرتا ہے اور یہ سوالات قرآن کے انکار پر کئے جارہے ہیں ۔کیا تمہارے پاس بھی کوئی دوسری کتاب ہے جسے دیکھ کر تم پڑھتے ہو (جس طرح ہمارے پاس بھی دوسری بہت سی کتابیں پڑھی جاتی ہیں)

ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم! ...... اگر تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے...... کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے جو (کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ) کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہے...... اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں...... جو پروردگار عالم کی طرف سے اتارا گیا ہے...... کیا تم اس الحدیث (القرآن) سے انکار کرتے ہو؟ اور تم بناتے ہو اپنا (رِزْقَکُمْ) (وظیفہ) کہ تم جھٹلاتے ہو۔ (سورۃ واقعہ 75 تا 82) ان آیات کریمہ میں رب کریم آفاقی قوانین کو بطور شہادت پیش فرما کر ہمیں یہ رہنمائی عطا فرما رہے ہیں کہ جس طرح تمہیں (نبی اکرم کے مخاطب عرب) آسمان پر ستاروں کی گردش اور ان کی منزلوں سے واقفیت ہے اور ان پر ایمان و اعتماد کے ساتھ رات کو ستاروں کی روشنی میں محو سفر رہتے ہو اور اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہو اس طرح یہ قرآن بھی ایک گرامی القدر کتاب ہدایت ہے اور یہ فرشتہ سیرت کردار کے حامل لوگوں کے ہاتھوں محفوظ کتاب میں لکھی ہوئی ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود بھی لے رکھی ہے اور یہ پرودگار عالم کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ لہٰذا تم اپنے سفر زندگی میں اسی طرح رہنمائی حاصل کرو جس طرح تم ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جاتے وقت دوران سفر رات کو ستاروں سے رہنمائی لیتے ہو تم اس کلام وحی سے انکار نہ کرو اور اس کی تکذیب کر کے اپنا رزق حاصل نہ کرو۔

قسم ہے طور سینا کی......اور (کِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ) کتاب لکھی ہوئی ہے...... (فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ)...... کشادہ اوراق میں......اور (الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ) آباد گھر کی...... (وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ) اور اونچی چھت کی۔ (الطّور 1 تا 5) تاریخ شاہد ہے کہ وہ طور سینا جہاں سے کبھی رشد و ہدایت (وحی الٰہی) کی آواز بلند ہوئی تھی اب وہی رشد و ہدایت (وحی الٰہی) اس کتاب (قرآن) میں لکھی ہوئی ہے اور بڑے بڑے کشادہ ہرن کی جھلی کے کاغذوں پر اور یہ خدا کے آباد

گھر میں (خانہ کعبہ) مرکز رشد و ہدایت جس کی تابانی اوج فلک تک جا رہی ہے۔

دیکھو یہ قرآن نصیحت ہے..... پس جو چاہے اسے یاد رکھے.....(فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ) قابل ادب ورقوں میں لکھا ہوا..... جو بلند مقام پر رکھے ہوئے اور پاک ہیں..... ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار اور نیکوکار ہیں..... انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے..... (سورت عبس 11 تا 17) یہ ایک حقیقت ہے اور اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ (یہ قرآن) واضح صحیفہ اور کھلی کتاب ہدایت ہے لیکن اس کا فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے اس کی طرف قلب سلیم لے کر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اسے بند صندوقوں میں چھپا کر نہیں رکھا (جس طرح یہودیوں نے تورات کو ایک تابوت میں بند کر کے مقفل کر رکھا تھا) بلکہ اسے نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں بلندی فکر اور پاکیزگی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے لکھنے والے بھی نہایت اعلیٰ اخلاق و کردار کے حامل' صداقت و شرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اترنے والے ہیں۔ اب سوچئے جو اس قسم کی بلند پاکیزہ تعلیم کو جاننے سے انکار کر دے تو اس سے زیادہ تباہ و برباد ہونے والا کون ہو سکتا ہے۔

اے محمد! ..... رات کو قیام کیا کرو مگر تھوڑی رات.....یعنی نصف رات یا اس میں بھی کچھ کم یا کچھ زیادہ اور (وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلاً) یعنی قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو (سورۃ المزمل 1 تا 4) دوسری جگہ ارشاد ہے وَرَتَّلْنٰہُ ''تَرْتِیْلاً (الفرقان 32) ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب' تناسب اور نظم کے ساتھ نازل کیا اس کے اجزاء کو نہایت خوبصورتی سے باہمدگر جوڑا ہے .....مزید ارشاد ہے .....اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی (وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ (الاحزاب 33) آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں۔ ان کو یاد رکھو اس کے بعد پھر ارشاد ہوا۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں۔ جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے (فِیْ صُدُوْرِ) ان کے سینوں میں محفوظ ہے (العنکبوت 49) بے شک یہ کتاب نصیحت ہمیں نے اتاری ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں (الحجر 9) ان آیات کریمہ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے عالم امر کو جب عالم خلق میں لاتے ہیں تو انسانوں کے متعلق ہدایت و رہنمائی انسانوں ہی کے ذریعے سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ قرآن کریم کی حفاظت کو بھی انسانی ذریعے سے ہی محفوظ بنانا تھا۔ مزید یہ کہ نبی المکرّم ﷺ کے فرائض منصبی میں یہ امر بھی شامل تھا کہ آپ اس وحی الٰہی (قرآن) جو قیامت تک کیلئے انسانیت کا ضابطہ حیات بننے جا رہا تھا اسے شفاف اور شک و شبہ سے بالاتر محفوظ حالت میں امت کو دے کر جائیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ نبی المکرّم ﷺ اور تمام مومنین کو پڑھنے' قلم سے لکھنے اور علم

حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی اور ہر انسان پر یہ لازم کر دیا گیا کہ وہ قرآن کریم پڑھیں اور یاد بھی رکھیں۔ نبی المکرّم ﷺ بذات خود بھی اکثر اوقات (خصوصاً رات کے وقت) قرآن پڑھتے اور یاد رکھتے تھے (آج کل کی اصطلاح میں حفظ کرنا کہتے ہیں) جس میں صحابہ کرامؓ بھی شامل ہوتے تھے اس کے علاوہ نبی المکرّم ﷺ کی ازواج مطہرات اور صحابہ کرامؓ کے گھروں کی خواتین بھی قرآن پڑھتیں اور یاد رکھتی تھیں۔اس طرح قرآن کو پڑھنے اور اسے حفظ کرنے کا ایک نظام (SYSTEM) وجود میں آ گیا جس کے ذریعے ہمہ وقت قرآن کریم پڑھا اور یاد کیا جانے لگا۔نتیجتاً قرآن کریم پڑھتے اور یاد کرتے کرتے مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہو گیا اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی حفاظت ونگہبانی کے اعلان کے مطابق محسوس اور عملی طور پر محفوظ اور سربمہر کر دیا گیا۔اس وقت کی معلوم دنیا میں کسی بھی مذہبی تصنیف کا آج تک اس سے بہتر حفاظت کا طریقہ دریافت نہیں ہو سکا۔

یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے ......لوح محفوظ میں لکھا ہوا (بروج 21-22) یہ اُمُّ الکِتَاب ہے یعنی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی بڑی فضیلت اور برکت والی۔

یہ ایک غلط تصور یا مغالطہ جو ہمارے ہاں فروغ پا چکا ہے اچھے بھلے صاحب علم محترم حضرات اس کے اسیر چلے آ رہے ہیں وہ یہ کہ قرآن سات قرءات میں نازل ہوا تھا اس تصور و مغالطہ نے قرآن کریم کی صحت' لاریبیّت' اسکی حفاظت وحقانیت کو مشکوک ومحرف بنا کر رکھ دیا۔اس غلط تصور و مغالطہ سے محترم اسرار عالم صاحب کی اس بات کو بیحد تقویت ملتی ہے کہ اس وقت کے منافق یہودیوں اور ایرانیوں نے دین اسلام کی دشمنی میں اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر غلط قسم کے تصورات اور مغالطّوں کو Creat کر کے دین اسلام میں داخل کر کے انہیں پھیلایا، عام کیا اور اس کے جوہر وتوانائی اور برق رفتار ربوبیت عالمینی کی صلاحیتوں کو مضمحل و بے اثر کر کے ایک چلا ہوا کارتوس بنا کر رکھ دیا ہے۔اب اس کتاب (القرآن) کے وارث شبہے میں پڑے ہوئے ہیں (شوریٰ 14) اس ضمن (سات قرأت) میں قرآن کریم سے کوئی شہادت نہیں مل سکی لیکن قرآن کریم سے سات قرآت کی تردید میں جو مجھے راہنمائی ملی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں بنایا تا کہ تم سمجھ سکو...... (الزخرف 2،احقاف 12) اور یہ کہ یہ قرآن مکہ مکرمہ کے گردونواح میں بولی جانے والی عربی میں نازل ہوا (الخ شوریٰ 7) جو کہ ایک فصیح عربی زبان تھی (الخ الشعرا 195)

اے پیغمبر! وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اس کو جلد یاد کرلو...... اس کا جمع کرنا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے...... جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم اس کو سنا کرو اور پھر اسی طرح پڑھا کرو...... پھر اس کے معانی کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔(سورۃ قیامہ 16 تا 19) ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنی عظیم الشان حقیقتوں کا بیان فرما کر ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ قرآن کی جمع و

تدوین بھی ہمارے ذمہ ہے۔قرآن کریم کا پڑھانا بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے اس کے بعد قرآن کے معانی ومطالب کی توضیح وتشریح بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اسی لئے اسے کسی قسم کے خارجی سہاروں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔قرآن کریم اپنی تشریح خود اپنے آپ تصریف آیات (الانعام 65, 105 ' بنی اسرائیل 89) سے اپنے معانی ومطالب خود ہی واضح کرتا ہے۔جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے اپنے آپ کو.....نُـور'' وَ کِتٰـب'' مُبِیـن'' کہا ہے (سورۃ مائدہ15) کہیں اٰیٰتٍ بَیِّنٰت (النور1).....کہا ہے.....کہیں نور کہا ہے (الاعراف157 ..... تغابن8) نور بذات خود ایک روشنی ہے جس کے لئے خارج سے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔

اور آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی کتاب العظیم کو ایک اور آفاقی طریقے سے سر بمہر کر کے شک وشبہ کے تمام راستے بند کر کے یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ..... یہ ایک عالی رتبہ کتاب ہے اس پر جھوٹ (باطل) کا دخل نہ آگے سے ہوسکتا ہے اور نہ ہی پیچھے سے اور دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے (حم السجدۃ41-42) یہ عظیم الشان بیان اللہ تعالیٰ کے ہی شایان شان ہوسکتا ہے! ہے کوئی ایسی کتاب؟ یا مصنف یا شخصیت؟ جس کا یہ دعویٰ ہو کہ میری یہ کتاب ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے.....اور اگر تم اس کتاب میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمائی ہے۔کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورہ تم بھی بنا لاؤ اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو (البقرہ23) اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے (القمر40) اور جو کوئی شخص اپنے تئیں کو خدا کا فرماں بردار کر دے اور نیکو کار بھی ہو تو اس نے مضبوط دستاویز ہاتھ میں لے لی (سورۃ لقمان22)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

صلوٰۃ بحیثیت قرآنی نظام

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور قرآنی نظام! دین (اجتماعی نظامِ زندگی) کے لئے بھی جس میں خدا کی محکومیت (عبودیت) پورے خلوص کے ساتھ کرنا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامتِ الصلوٰۃ سے مراد نماز کے اجتماعات ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام۔ مثلاً وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (۵/۸۹)۔ قرآن میں اس کے علاوہ اور کیا تعلیم پیش کی گئی ہے کہ لوگ، محکومیت اور اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کریں۔ اس کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم تسلیم نہ کریں۔ ہر طرف سے ہٹ کر اس ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں یعنی نظام الصلوٰۃ قائم کریں (دین کو محکم رکھیں) اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں۔ بس یہی ہے وہ محکم نظامِ زندگی جو انسانیت کے قیام کا ضامن ہو سکتا ہے۔ آیت کریمہ میں پہلے دین کا لفظ اطاعت وفرماں پذیری کے لئے آیا ہے اور دوسری دفعہ نظامِ زندگی کے لئے اور یقیموا الصلوٰۃ، قرآنی نظام! نظامِ خداوندی! نظامِ الصلوٰۃ یعنی اللہ کے عطا کردہ دین کے لئے استعمال ہوا ہے۔ غور کیجئے اگر محض نماز پڑھنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ہی دینِ اسلام ہے تو پھر کبھی کبھار مذہبی راہنما اپنے مفاد کی خاطر اور اقتدارِ حکومت پر براجمان آمر اپنے اقتدار کو طول دینے کے پیشِ نظر اسلام یا اسلامی حکومت کا راگ کیوں الاپتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر محترم جنرل ضیاء الحق مرحوم گیارہ سال تک اسلام اسلام کہتے رہے بالآخر انہوں نے کہا میں اسلام نافذ نہیں کر سکتا۔ (جب کبھی قرآنی نظام دوبارہ قائم ہوا تو اس کے استحکام و بقاء اور مشاورت کے لئے نماز کے اجتماعات کی اہمیت اور بڑھ جائے گی۔ یہ اس لئے لکھا ہے کہ بعض کٹ حجتیاں کرنے والے حضرات سوال کر دیتے ہیں کہ جب نظامِ الصلوٰۃ قائم ہو جائے گا تو کیا پھر نماز پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی)۔

سورۃ الروم میں ہے کہ خدا کا قانونِ تخلیق غیر متبدل ہے (اور جو نظامِ زندگی انسانی معاشرہ کے لئے

بذریعہ وحی دیا گیا ہے اسی طرح غیر متبدل ہے)۔ یہی وہ نظام زندگی ہے جو نہایت محکم اور تمام نوعِ انسان میں توازن قائم رکھنے کا موجب ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ اس کے بعد ہے مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳۰/۳۱)۔ یہ نظام کیا ہے؟ یہ کہ سفرِ زندگی میں تمہارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھے جو خدا نے تمہارے لئے تجویز کی ہے۔ تم اس کی پوری پوری نگہداشت کرو۔ اس کے لئے نظامِ الصلوٰۃ قائم کرو جس میں ہر فرد بطیبِ خاطر قوانینِ خداوندی کا اتباع کئے چلا جاتا ہے۔ اس اتباع اور اطاعت میں کسی اور کے قانون اور فیصلے کو شریک نہ کرو۔ (اس سے پہلے خود تمہارے اپنے اندر وحدتِ فکر و عمل پیدا ہو جائے گی اور اس کے بعد پوری نوع انسانی اپنے اختلافات کو چھوڑ کر امت واحدہ بن جائے گی۔ یہی دین کا مقصود ہے)۔ اس آیت کریمہ میں بھی اقیموا الصلوٰۃ سے مراد نظامِ الصلوٰۃ یعنی اقامتِ دین ہے۔ ظاہر ہے نماز پڑھتے وقت کوئی بھی شخص کالی دیوی یا شمبھو ناتھ کی پوجا اور پرستش تو نہیں کر سکتا جس سے وہ مشرک ہو جائے گا۔ اس سے اگلی آیت میں اللہ نے خود اس کی تشریح، تفسیر، وضاحت کر دی کہ یہ دین کی بابت کہا گیا ہے۔ جب کہا وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)۔ لہٰذا تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ بن جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح امت واحدہ رہنے کی بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے۔ تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا۔ (دین میں فرقے نہیں ہوتے۔ لیکن جب دین میں فرقے بنا دیئے جائیں تو وہ دین نہیں رہتا مذہب بلکہ مذاہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ایسا کرنے والوں کا رسول ﷺ سے کوئی واسطہ نہیں رہتا (۶/۱۶۰)۔

اقامتِ الصلوٰۃ کے لئے استخلاف فی الارض، تمکن فی الارض یعنی اپنے ملک کا ہونا ضروری ہے۔ نماز تو غیر مسلم ممالک میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور پڑھی جاتی ہے۔ یہاں تو Church (گرجے) بے آباد پڑے ہیں اور بعض ناعاقبت اندیش مولوی چندہ کی رقم سے سستے داموں گرجے خرید کر ان میں نمازیں پڑھا رہے ہیں جو کہ مذہبی اور سیاسی دونوں لحاظ سے مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۶۳۷ عیسوی میں جب مسلمانوں نے عیسائیوں سے یروشلم فتح کیا تو حضرت عمرؓ وہاں تشریف لے گئے۔ کلیسا کے اندر ان کے لارڈ پادری سے بات چل رہی تھی اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے کہا میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں آپ کے لئے یہاں

کپڑا بچھا دیتا ہوں نماز کا فریضہ ادا کر لیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا نہیں۔ آپ باہر نکلے اور ٹائٹس (رومن) کے ہاتھوں یہودیوں کو یروشلم سے مار بھگانے کے بعد ان کے تباہ کئے گئے (Demolished) سلیمانی ہیکل کے کھنڈر (جہاں عیسائی کوڑا کرکٹ پھینکا کرتے تھے) کے قریب پڑے ہوئے چٹان نما پتھر کو خود صاف کیا اور وہاں نماز پڑھی۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ حضرت عمرؓ نے کلیسا (گرجا) میں نماز کیوں نہ پڑھی۔ (انجیل میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیش گوئی کے تحت لکھا ہے کہ ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے یہودیوں کو شکست دے کر وہاں سے ان سب کو ملک بدر کر دیا تھا اور ان کی عبادت گاہ سلیمانی ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اسے کھنڈر بنا دیا تھا۔) یعنی ۷۰ عیسوی سے ۶۳۷ عیسوی تک یروشلم پر عیسائی قابض رہے اس عرصہ میں یہودیوں کا داخلہ وہاں ممنوع تھا اور وہاں ان کی کوئی عبادت گاہ موجود نہ تھی سب گرا دی گئی تھیں سوائے ایک چھوٹی سی دیوار۔ بعد میں جب مسلمانوں نے انہیں وہاں داخلہ کی اجازت دی تو انہوں نے اس دیوار کا نام دیوارِ گریہ رکھا اور ہر سال اس دیوار کے پہلو میں جمع ہو کر اپنا کھویا ہوا ملک دوبارہ حاصل کرنے کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتے تھے اور مسجد اقصیٰ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۷۲ ہجری میں تعمیر کروائی تھی۔

سورۃ الحج میں مومنین کے متعلق ہے کہ الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲/۴۱)۔ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی۔ انہیں اقتدار حاصل ہو گیا (تو یہ ظلم اور استبداد نہیں کریں گے) یہ نظامِ الصلوٰۃ قائم کریں گے (تاکہ تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں) یہ تمام نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانون خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام ایسے کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا غرضیکہ یہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق دیکھیں گے کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس طرح ان کی حکومت میں بحث وتمحیص اور باہمی مشاورت کے بعد آخرالامر ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔

سورۃ شوریٰ میں مومنوں کے متعلق ہے: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۴۲/۳۸)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ نظامِ الصلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں جو انہیں یہ سکھاتا ہے کہ تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں اور جو سامانِ زیست انہیں حاصل ہو (اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی) نوعِ انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے کھلا

رہنا چاہئے۔ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم میں جہاں ''اقیموا الصلوٰۃ'' نماز کے لئے آیا ہے وہاں اس کے معنی نماز کے لئے اکٹھے ہونا۔ کھڑے ہونا۔قوانین خداوندی کا اتباع کرنا ہے۔ مقصد اس سے قرآنی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کرنا۔کوشش کرنا اوراسے پروان چڑھانا ہے۔ اس سے واضح ہوگیا کہ نماز (صلوٰۃ)! قرآنی نظام کو قائم کرنے اوراسے مستحکم رکھنے کا ذریعہ ہوا۔خلفائے راشدین کے بعد سے آج تک مسلمان عبوری دور سے گزر رہے ہیں اس لئے نماز کا مندرجہ بالا مقصد ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر ہونا چاہئے۔مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد ہمارے دورملوکیت میں مذہبی پیشوائیت نے لفظ صلوٰۃ کا ترجمہ فارسی زبان میں نماز کیا اور اسے دعا کرنا worship-prayer کے معنی پہنا کر خدا کی محکومیت و اطاعت کے بجائے اس کی پرستش ٹھہرا دیئے۔ اس طرح مقصد ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور نماز کو مقصود بالذات بنا کر دنیا کے کسی بھی مسلم ملک میں قرآنی نظام کا قیام بہت مشکل کر دیا۔ دوسری نمازوں کو تو چھوڑ یئے۔ جمعہ کی نماز کو لیں۔آپ کسی بھی مسجد میں جائیں اورغور کریں۔ خطیب حضرات قرآن کی رسمی تلاوت کرنے کے بعد ان آیات کا مفہوم بیان کرنے اور سورۃ جمعہ ہی کی نماز والی آیت کے مطابق قوانین خداوندی لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے بجائے اشخاص پرستی' اسلاف پرستی فرقہ پرستی کو ہوا دینے والی باتیں کرنے کے بعد دورملوکیت کا وضع کردہ خطبہ پڑھ کر نماز پڑھا دیتے ہیں' بعض خطیب حضرات خطبہ میں السلطٰن ظل اللہ علی الارض ابھی تک دوہرائے چلے جا رہے ہیں حالانکہ سلطانوں کو مرے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔۔ یہ نظامِ خداوندی کے قیام کا نام تک زبان پر نہیں لاتے۔ امورِ مملکت میں مشاورت کرنا قرآنی مملکت یعنی امت کے نمائندوں' افسرانِ ماتحت (اولی الامر) نمائندگانِ قرآنی نظام کا کام ہے تاکہ وہ افراد معاشرہ بلکہ تمام نوع انسان کی بہبود کے سامان وذرائع اور سیاسی امور پرغور کریں۔ مشاورت فتویٰ گروں کا کام نہیں۔ اگر اس آیت کریمہ میں اقاموا الصلوٰۃ کے معنی محض نماز کے اجتماعات کئے جائیں تو بات بنتی ہی نہیں۔ ہماری نمازوں کے اجتماعات میں نہ تو مشاورت کی ضرورت پڑتی ہے نہ کبھی مشاورت ہوئی ہے اور نہ ہی ہوسکتی ہے کیونکہ یہ عام نمازیوں اور آئمہ مسجد کا کام نہیں ہے۔آئمہ مسجد حضرات کیا خاک مشاورت کریں گے یہ تو بارہ سو سال سے رمضان اور عیدین کے چاند کا مسئلہ حل نہیں کر پائے۔ حالانکہ اللہ نے سورج اور چاند دونوں کو نوع انسان کی آسانی کے لئے اس طرح مسخر رکھا ہے کہ وہ اس کے متعین کردہ اپنے اپنے ایک ہی راستہ پر ہمیشہ ہمیشہ مسلسل' بلا انقطاع کئے اپنی رفتار کے مطابق چلتے رہتے ہیں اور چاند کی تو منزلیں مقرر کر کے اسے مہینوں اور تاریخ کے تعین (کیلنڈر) کے لئے مزید آسان بنا دیا گیا ہے لیکن ہم نے اسے ایسی چکور بنا رکھا ہے جو نہ دیکھی جاسکتی ہے نہ پکڑی جائے اور نہ ہی کسی طریقہ

سے قابو میں آئے۔

سورۃ الجمعہ میں نماز کے متعلق اللہ کا حکم ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۶۲/۹)۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمہیں ملی اجتماعِ صلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر اس کی طرف لپک کر آ جایا کرو تاکہ تم اپنے کانوں سے سن لو کہ وہ قوانین خداوندی و ہدایات جو تمہارے سامنے پیش کی جانے والی ہیں کیا ہیں جن کے لئے تمہیں بلایا گیا ہے اور جن کے مطابق تمہیں کام کرنے ہیں۔ اگر تم ذرا بھی علم و بصیرت سے کام لو گے تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آ جائے گی کہ یہ اجتماعات تمہارے لئے کس قدر منفعت بخش ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متعدد آیات میں ذکر کہا ہے وہ اس لئے کہ یہ قوانینِ خداوندی کا مجموعہ ہے۔ (اللہ کی طرف رجوع۔ اللہ کے ذکر (قرآن) کی طرف رجوع۔ اللہ کے قوانین کی طرف رجوع' ایک ہی بات ہے) لیکن ہوا یہ کہ قرآن کے تراجم اور تفاسیر میں ذکر اللہ کے معانی اللہ کو یاد کرنا لکھ کر بھی نماز کو اللہ کی پرستش کرنے کا ذریعہ بنا کر مسلمانوں کو ذکر و فکر صبح گاہی میں ایسا الجھایا کہ دین کی کوئی بات قوم کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ نمازیں پڑھی جا رہی ہیں تسبیح پر زور ہے ساتھ ہی قوانین خداوندی سے سرکشی اور دنیا کا ہر غلط کام سرزد ہو رہا ہے۔ ملا کہتا ہے نماز اپنی جگہ باقی کام اپنی جگہ۔۔۔ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا فریضہ اقامتِ دین تھا (۴۲/۱۳)۔ سورۃ مریم میں ہے ان سب کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اس کے بعد ہے کہ: فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹/۱۹)۔ ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انہوں نے نظام الصلوٰۃ کو ضائع کر دیا یعنی (قوانین خداوندی کے اتباع کے بجائے) اپنے اپنے مفاد اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ یہ بہت جلد اپنی ہلاکت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ لیں گے۔

حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں وہ سب کی سب Defensive Wars تھیں۔ کسی بھی جنگ میں مومنین نے اپنے مخالفین پر پہلے چڑھائی نہیں کی تھی۔ (جب مکہ فتح ہوا۔ جب دروازے کھل گئے تو اس وقت جنگ ہوئی ہی نہیں تھی)۔ یہ جنگیں نماز کی حفاظت کے لئے نہیں لڑی گئی تھیں بلکہ نظام کی حفاظت کی خاطر لڑی گئی تھیں (۸۔۷/۶۰)۔ اسی لئے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ یہ لوگ (ان کے اپنے لئے قائم کردہ) نظامِ الصلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں: وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ (۲۳/۹)۔ قریشِ مکہ اس نظام کے خلاف تھے جو حضور نبی کریم ﷺ اور جماعتِ مومنین کے ہاتھوں قائم ہونے والا تھا۔ (کوئی شخص اپنے گھر میں رام رام کرے یا اللہ اللہ۔ پوجا کرے یا نماز پڑھے پڑوسیوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟) جب حضور ﷺ

اور مومنین مکہ سے ہجرت کر کے تین سو میل دور مدینہ میں آ گئے تھے تو پھر قریش ایک ہزار آدمیوں کا لشکر لے کر مومنین کو نماز پڑھنے سے روکنے کے لئے نہیں' قرآنی نظام کی مخالفت میں جنگ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں آ گئے تھے۔ قریش کو علم تھا کہ اگر یہ نظام کسی چھوٹے سے قصبہ میں بھی قائم ہو گیا تو سارا عرب اس میں داخل ہو کر امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے گا اور ان کے نظام ظلم کی جڑ کٹ جائے گی۔ معزز قارئین! آج بھی مسلمانوں کے ساتھ ان کے اپنے آزاد ممالک میں سرمایہ دارانہ مغربی جمہوریت کا نظام بچھانے کی خاطر یہی ہو رہا ہے۔ اپنے نظام کی حفاظت اور اسے پھیلانے کے لئے جنگیں لڑی جا رہی ہیں تاکہ مسلم ممالک میں سے کسی ایک بھی ملک میں قیامت تک قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ انہیں بھی بخاری شریف کی رو سے اسی (۸۰) سال کے گناہ بخشوانے والی ہماری مذہبی نماز سے کوئی خطرہ نہیں' خطرہ دین اسلام ہے۔ (کوئی مذہبی راہنما خلاف دین' مغربی جمہوریت یعنی سیکولرازم کے خلاف نہیں بولتا وہ اس لئے کہ اس نظام میں پرسنل لا یعنی مذہبی امور پر ان کی اجارہ داری ہوتی ہے) مانچسٹر کا واقعہ ہے ایک پاکستانی بس ڈرائیور سڑک پر بس کھڑی کر کے فٹ پاتھ پر نماز پڑھنے لگ گیا۔ نہ کسی سواری نے اعتراض کیا کہ ہمیں دیر ہو رہی ہے اور نہ ہی کسی راہی نے اسے نماز پڑھنے سے روکا۔ نماز پڑھنے سے روکنا تو ایک طرف یہاں کی گورنمنٹ مسجدوں کے لئے گرانٹ دیتی ہے۔ چند سال پہلے یہاں کی حکومت نے گھروں پر ٹیکس کے قانون کو زیادہ ٹیکس وصول کرنے کی خاطر گھروں میں رہنے والے انسانوں پر پول ٹیکس کے قانون میں بدل دیا لیکن اس میں آئمہ مسجد کے لئے استثناء رکھ دی تھی۔ یہ شاید اس لئے کہ اور زیادہ مسجدیں بناؤ تاکہ ہم تمہیں اور گرانٹ دیں یا یہاں کے قانون ساز ممبرز آف پارلیمنٹ ان حضرات کو انسانوں میں شمار ہی نہیں کرتے۔ مصلین کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ وہ مال جمع نہیں کیا کرتے۔ ان کے اموال میں (قرآنی نظام کی وساطت سے) سائل ومحروم کا حق معلوم ہوتا ہے (۲۶۔۷۰/۱۷)۔ اہل جہنم سے پوچھا جائے گا کہ تم یہاں کیسے آ گئے۔ وہ کہیں گے کہ ہم مصلین میں سے نہیں تھے یعنی وہ کچھ نہیں کیا کرتے تھے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (۴۵۔۷۴/۴۲)۔ اس سے واضح ہو گیا کہ مصلین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ قرآنی نظام کے قیام و استحکام اور بقا کے لئے جدوجہد کرنے والے اور دوسرے مذہبی ورسمی نماز پڑھ کر دل کی تسلی کے لئے لمبی لمبی دعائیں مانگ کر مطمئن ہو کر بیٹھ رہنے والے۔ ایسے مصلین کے متعلق سورۃ الماعون میں ہے کہ: تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو الصلوٰۃ کے مفہوم ومقصود سے بے خبر رہتے ہیں۔ دکھاوے کی رسم ادا کرتے ہیں اور رزق کے جن چشموں کو ہر ایک کی ضروریات کے لئے بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہئے انہیں بند لگا کر روک رکھتے ہیں اور اس طرح تکذیبِ دین کرتے ہیں۔۔۔

تکذیب کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اللہ کا ارشاد ہے کہ اقوام سابقہ کے احوال وکوائف پرغور کرواور دیکھو کہ مکذبین کا انجام کیا ہوا (۳/۱۳۶)۔تکذیبِ آیات کرنے والی قوم آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ بتدریج تباہی کی طرف کھچے چلی جاتی ہے (۱۸۲/۷)۔ایسی قوم کی دولت و حکومت دوسری قوم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے (۱۳۷۔۱۳۶/۷) اور بھوک وخوف کا عذاب اس پر مسلط ہو جاتا ہے (۱۱۳۔۱۱۲/۱۶)۔''نہ بجلی نہ پانی نہ چاول نہ آٹا' بم دھماکہ یہ عذاب نہیں تو اور کیا ہے''۔تکذیبِ حق سے اس دنیا میں بھی ذلت کا عذاب آتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ (۳۹/۲۶)۔سوال یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک کون سا گروہ ایسا ہے جو اللہ اور الحق کی تکذیب کرتا اور کرواتا چلا آرہا ہے۔قرآن کا جواب ہے کہ یہ احبار و رہبان (علماء مشائخ) مذہبی پیشوائیت کے انبوہ کا کام ہے۔ یہ لوگ باطل طریق سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور دین کے راستہ میں روک بن کر کھڑے رہتے ہیں (۹/۳۴)۔ یہ اپنے معاشی مفاد (رزق) کی خاطر تکذیب کرتے ہیں (۵۶/۸۲)۔ اور اپنی من گھڑت جھوٹی باتوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں (۴/۵۰)۔خود وضع کردہ کتاب اور شریعت کو خدا کی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں (۳/۷۸)۔ ان کی ٹیکنیک (علمِ کلام) کے متعلق خدا نے واضح طور پر فرما رکھا ہے کہ: وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقاً يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۳/۷۸)۔ان میں یہ گروہ ایسا ہے جو اپنی طرف سے باتیں وضع کرتے ہیں اور پھر انہیں الکتاب (قرآن) کے ساتھ اس طرح بٹ دیتے ہیں کہ وہ دونوں مل کر ایک ہی نظر آئیں اور یوں ان کی باتیں خدا کی شریعت بن جائیں۔ (جب ان سے پوچھو تو) پوری دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ باتیں بھی خدا ہی کی طرف سے ہیں' حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں۔ اس طرح یہ لوگ دیدہ دانستہ خدا کے خلاف جھوٹ بولتے اور افترا پردازی کرتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ لوگوں سے اپنی باتیں منوائیں اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔

WAR AND PEACE

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

Islam is an invitation for universal peace. One of the meanings of the word 'Islam' is peace. Traditionally, whenever two Muslims meet, they wish each other peace. In fact, one of the characteristics of Muslims is that whomsoever they meet, they wish him peace.

"Only the saying, peace, peace…56/26

The concept of universal peaceful-co-existence, as suggested by Islam, has been discussed in detail when we were considering an Islamic political system.

Islam recognizes that there will be people who will wish to disturb peace to obtain unlawful advantage for themselves. Nations may even go to war with peaceful neighbors to acquire some benefits for themselves. Islam exhorts Muslim nations to keep themselves ready to oppose the machination of such people. 'A military might' must be kept in readiness so that the enemies might think twice before indulging in violence.

"And make ready for them whatever force you can muster and horses tied at the frontiers, to frighten thereby the enemy of Allah and your enemy and others beside them…" 8/60.

This is mobilization for self defence and the defence of a way of life. Mischief seeking people would be prevented for oppressing fellow beings who are fully equipped to take them on. Muslim people are forbidden to resort to violent means when persuading other people to accept their way of life. But they must also not submit to violence when other people initiate it for nefarious designs.

The Quran allows a resort to war only on two occasions. First, when their country, nation or way of life is threatened.

"Permission (to fight) is given to those on whom war is made because they are oppressed. And surely Allah is able to assist them. Those who are driven from their home without a just cause except that they insist on living by God's laws alone…" 22/39-40

This is a defensive war. Secondly, the Muslims are also permitted to initiate a war when an oppressed nation or people who are being denied human rights of freedom, call upon them for assistance against the oppressor. Most Muslims had migrated from Mecca to Medina where they had established their own sovereign state. For various reasons, some Muslims remained in Mecca. The local rulers perpetrated all sorts of oppression on them for no fault of their own.

Addressing the Muslims in Medina, the Quran says,

"And what reason have you not to fight in the way of Allah and of the weak among the men and the women and the children who say our Nourisher , take us out of this town whose people are oppressors and grant us from thee a friend and grant us from thee a helper…"4/75.

It must be noted that the only two occasions the Muslims have been allowed to go to war are when violence is initiated by the enemy either in the form of a full fledged declared war or in the form of violating human rights by force of people who are not in a position to fend for themselves. In no other case, whatever, are the Muslims allowed to initiate violence for war. All disputes must be settled in a peaceful manner.

"And fight in the way of Allah against those who fight against you but never be aggressive (or transgress the Allah's Limits)…"2/190.

So much for the oft repeated myth that Islam spread by the sword. If individual Muslim rulers in history did do so, it was clearly in violation of Allah's laws. Islamic preference for a peaceful settlement of differences is demonstrated by the divine injunction.

"And if they incline to peace, incline you also to it and trust in Allah…" 8/61.

There is no insistence on an unconditional surrender. Even if the Muslims have a strategic or tactical advantage over the enemy, fighting must stop because there has appeared a reasonable chance that a recourse to violence is no longer necessary for settlement of the dispute. In fact, the Quran suggests that there should be an international agreement that there should be long periods of cease-fire so that emotions cool down and reason takes over.

"Surely, the number of months with Allah is twelve by Allah's ordinance since the day when He created the heavens and the earth – of these four are sacred…9/36.

Men of arms would protest against such an arrangement. Whenever, an army is strategically on the offensive and has the opponent on the run, the generals would hate to cease-fire. But the aim of all wars is to regain peace. No vested interest of any type must be allowed to interfere with this process. In fact, the Arabs in the times of Messenger Mohammed (pbuh) has such an arrangement of four moths as of cease fire in force. There was, however, a small complication. The Arabs worked on a lunar calendar. It had 356 days. To conform to the seasons, they used to forget one month every three years to be in conformity with a solar calendar. This practice was called *'Nasee'*. Those who kept a record of the cease fire months used to cheat at times when they had a military advantage. The Quran has condemned this.

"Postponing of the sacred months is only an addition in disbelief whereby those who disbelieve lead people astray. They allow it one year and forbid it another year that they may agree in the number of months which Allah had made sacred and thus make lawful what Allah has forbidden…." 9/37

Once a war has been initiated and there is no inclination towards peace from any side, the Quran exhorts the Muslims to fight with no holds barred so that a state of war may be brought to an end as quickly as possible.

"And fight them wherever you find them and drive them out from where they drove you out. Remember, a state of persecution and lack of peace is worse than slaughter. Do not fight them in agreed places where war has mutually been banned by agreement but if they insist on fighting in these places, you do the same. Such is the recompensation of those who renege from agreements. But if they desist, then surely Allah safe-guards and nourishes. And keep on fighting them until there is no persecution and Laws of Allah apply everywhere. But if they desist, there should be no hostility except against the oppressors." 21/191-193

It would be seen that the aim of war is the elimination of persecution by the oppressors against weak people. No quarter is to be given until it is reasonably sure that the oppressor would no longer resort to nefarious activities.

"O Nabee, fight against the disbelievers and the hypocrites and be firm and violent in prosecution of war. Your enemy's abode is hell and it is not such a desirable destination.' 9/73

War is a serious business. It must be resorted to only after an in-depth analysis of factors requiring war.

"O you who believe, when you go forth to fight in Allah's Way, make deep investigation first. Say not to any one who offers you peace that you cannot be relied upon. Are you seeking a pretext to go to war for worldly profit.? Seek profits according to Laws of Allah. Before you accepted Islam, you were resorting to war for worldly profit. But now that you have been blessed with the adoption of a new way of life, stop this old habit and investigate before resorting to arms…." 4/94

The Quran appears not to encourage the existence of large, professional, standing armies because in the type of an idealistic society that it suggests, a resort to arms is very rare. But, if and when a war becomes inevitable, a lot of people living in peaceful and comfortable surrounding are to be mobilized for a violent exercise. A lot of motivation is required before large forces can be assembled who are prepared for significant sacrifice. They must believe in the fairness of the cause for which they are being asked to give their lives, when necessary.

"O Nabee urge the believers to fight. If there be of you twenty steadfast, they shall overcome two hundred … " 8/65.

Allah urges the Messenger (pbuh) to set up an example by being the first to volunteer for fighting in the way of Allah.

"O Messenger, arise and fight in the way of Allah (for a cause authorized by Allah). While it is true that you can take responsibility only for yourself and not for others (they may or may not volunteer), you must do your best to urge them for sacrifice in a correct cause…" 4/84.

Tell them:

“Do you think that you will enter paradise while Allah has not yet known those amongst you who fight in the way of Allah and are steadfast in their fight.” 3/142.

“Or do you think that you will enter paradise while there has not yet befallen upon you hard times that befell upon those who tried to bring about a revolution like you are trying to do. Distress and affliction befell them and they were shaking violently so that the Messenger and those who believed with him said, “when will the help of Allah come…” 2/214.

Whenever a set of people try to set up a universal society based on justice, freedom and fair play, exploiters are likely to oppose such an action. They might try violent methods to dislodge such a society when their other efforts fail. Allah’s soldiers must intervene in such a situation.

“....These are Allah’s troops. Now surely, it is Allah’ troops who are the successful. 58/22.

There is, of course, a great temptation for many people to avoid war when called upon to wage one in emergencies. They would come out with many excuses for dodging the draft. The Quran talks of such dodgers in very great detail.

“The holders back from among the believers, not disabled by injury, and those who fight hard in Allah’s way with their property and their persons are not equal. Allah has made the fighters with their property and their persons to excel the holders back a high degree.. 4/95.

Chapter 9 extensively talks about people who used to ask for permission to set out a war. Those who had a genuine reason for not going in war are excused duty.

"No blame lies on the weak, nor on the sick, nor on those who can find nothing to spend if they are sincere to Allah and His Messenger, nor on those to whom, when they came to you that you should transport them to battle, you said I can not find that on which to mount you. They went back while their eyes over flowed with tears of grief. The way (to blame) is only against those who ask permission from you when they are rich and able. They have chosen to be with those who remained behind…9/91-93

Also, verse 17 of Sura 48 is as follows;

"There is no blame on the blind, nor is there blame on the lame, nor is there blame on the sick…" 48/17

This list could be modernized for these days keeping in view the principle that Allah has strongly condemned those who deliberately dodge duty.

"And the draft dodgers from amongst the dwellers of the desert came that permission might be given to them and they sat (at home) who lied to Allah and His messenger. A painful chastisement will afflict those of them who disbelieve…."9/90.

These makers of excuses are further discussed in 9/94-96. The Messenger (pbuh) is told that when you come back from your expedition, they would rush to you swearing that next time they would respond to the call. Leave them alone, the Messenger (pbuh) is asked. They are likely to betray you again while, in fact, they are only betraying themselves.

"They will make excuses to you when you return to them. Say make no excuses; we shall not believe you. Allah has informed us about matters relating to you. And Allah and His Messenger will now see your actions, then you will be brought back to the Viewer of Unseen and the Seen, then He will inform you of what you did. They will swear by Allah to you when you return to them so that you may leave them alone. So leave them alone. Surely they are unclean and their abode is hell, a recompense for what they earned. They will swear to you that you may be pleased with them. But if you are pleased with them it is up to you. But surely Allah is not pleased with the transgressing people. " 9/94-96.

A whole paragraph from 9/81 to 9/89 is devoted to the description of the draft dodgers' psychology.

"Those who preferred to stay behind are glad on account of their sitting behind Allah's Messenger, and they were averse to fighting in Allah's way with their property and their person. They said to the fighters, " Go not in the heat". Say: the fire of hell is fiercer in heat.…" 9/81.

"O Messenger, never offer prayers for any one of them who dies, nor stand by his grave..9/84

Allah really shows His displeasure with the draft dodgers in a very strong language. This seems to make much sense in contemporary times and will, no doubt, be equally applicable in times to come.

The Quran has briefly commented on four of the more important battles led by the Messenger (pbuh) against aggressors. These are battles of Badr, Uhud, Ahzab and Hunain. Some important values governing war and peace have come up for discussion in these narrations. The main cause of the battle of Badr was the disbelievers' resolve to nip the political power and independence of the Muslims in the bud after the latter had fled from Mecca to establish an independent state in Medina; the immediate cause was the concern of the non-Muslims about the security of a rich trade caravan coming from Syria to Mecca. The non-Muslims were apprehensive that as the Muslims who were now established in an area from the vicinity of which the caravan had to pass on the way to its destination, they might loot it as was the Arab's custom. So, a large expeditionary force was dispatched from Mecca whose mission was to ensure that *Abu Sufyan's* caravan would proceed on its journey without interference. The Messenger's mission was to eliminate the habit of looting as well as squarely facing the inevitable and so prove that the aim of war is not monetary gain but elimination of aggression.

"And when Allah promised you one of the two parties that it should be yours and many of you wished that the one not armed should be yours, and Allah desired to establish the truth according to His laws and to cut off the root of the disbelievers. That He might cause the truth to triumph and bring the falsehood to naught" 8/7-8.

In the event, the Messenger (pbuh) let the trade caravan to pass in peace and took on the main aggressor force to defeat it decisively, in spite of a very large handicap in

quantum of force as well as weapons. And here the Quran stresses the importance of morale in war. When your cause is just and you are fighting for the establishment of Allah's value system, Allah's forces fight on your behalf.

"When you sought the aid of your Nourisher so He answered you: I will assist you with a thousand of the angles following one another. And Allah gave it only as good news, and that your hearts might be at ease thereby…" 8/9-10.

It is clear that no angels appear in the form of armed and equipped soldiers in battle. Those fighting for a just cause have high morale on their side, a great war winning factor, and those fighting the wrong enemy for a wrong cause, suffer from lack of intrinsic motivation which reduces their fighting capability very significantly.

"I will cause terror into the hearts of those who disbelieve. This is because they opposed Allah and His Messenger.. " 8/12-13.

Clearly God and His forces do not personally come into a battlefield, but God ascribes to Himself the military power and courage displayed by soldiers fighting on His behalf.

"So you slew them not but Allah slew them and you did not smite with arrows when you did smite but Allah smote them…" 8/17.

The Muslims must make a note that forces of Allah are not automatically with them because they pronounce themselves as Muslims. To deserve divine help, they must be fighting in the cause of Allah and not for any profit or motive.

The Quran emphasizes the vital importance of command and control as a battle winning factor when describing the battle of Uhud. After a decisive defeat at Badr, the disbelievers had assembled as a large and well equipped force for final annihilation of the Muslim menace for all times. The Muslims took up a defensive position on the mount Uhaud. To avoid an outflanking movement by the enemy, the Messenger (pbuh) detailed a detachment of his soldiers on a hillock over looking a flank. When the Muslims seemed to be on the verge of a victory, this detachment left their post, possibly in good faith, to participate in the final phase of the battle. But this was a disobedience of a clear command. The non-Muslims saw their opportunity and at a critical moment, succeeded in an outflanking maneuver and managed to appear in force in the rear of the Muslims' line of defense. Naturally, this created a panic.

"According to God's promise, you were slaying the enemy (in winning moments) when some of you displayed weakness and disputed about the affair and disobeyed after He had shown you that which you loved (a victory in battle). As a result you were running away in confusion and the Messenger was calling you in your rear..." 3/151-152.

The Messenger (pbuh) showed admirable courage and presence of mind when his troops were in complete disarray due to their own fault. This event highlights the importance of selection of good commanders and the importance of sticking to ones' assigned task, whatever the temptation for not doing so. This has been further emphasized in 8/15-16.

"O you who believe, when you meet your enemies in war, turn not your back to them. And one who turns his back to them on that day unless maneuvering for battle or turning to join company, he, indeed, incurs Allah's wrath…" 8/15-16

The Quran describes the battle of Ahzab, the third and the last of the more important defensive war led by the Messenger (pbuh) in Chapter 33. The enemy, in their final bid to completely annihilate the Muslims' menace once and for all, assembled a very large force, consisting of a large number of tribes and marched upon Medina.

This time, the Muslims defended the town with a type of maneuvers the Arabs were not accustomed to. They dug a trench round their defensive position and forced the enemy to camp outside Medina before they could breach the Muslims' defenses for a final assault. The Meccan Arabs were not prepared for such a situation; the Muslims were. So, here is an emphasis on constant preparation for a warlike situation by bringing about radical changes in strategy and tactics when required.

"Call to mind the favors of Allah to you when there came against you a large allied force. We sent against them a strong wind when they came upon you from above and from below you and when the eyes turned dull and the hearts rose up to the throats and there were believers shaken with a severe shaking…" 33/9-11.

The violent winds were a normal phenomenon. The enemy, not used to a reduction of an entrenched defensive position, were not prepared for a long period of camping. They could not face a determined defence and severe weather and had to go back to Mecca without achieving their aim.

If an army of believers can assemble a large force and equip itself well, it does not automatically achieve success in war. All other principles of war have to be complied with.

"Certainly Allah helped you in many battle fields and on the day of Hunain, when your great number made you proud, but they availed you nothing, and the earth with all its spaciousness was straitened for you, then you turned back retreating. Then Allah sent down his calm upon His Messenger and upon the believers..." 9/25-26.

Maintenance of good morale is a major principle of war and commanders must ensure this under all circumstances. This psychological strength is referred to as (hosts which you saw not). There is not even a hint of armed angels in the Quran who come to the believers' help in critical moments.

I may briefly mention here an episode concerning the Jews' behavior during a defensive battle which the Quran has not named. It appears that the resident Jews of Medina had an agreement with the Muslims, that they would help the latter in case non-Muslims threatened Medina. Precisely, on such an occasion, the Jews broke the agreement and did not come to the help of the Muslims when Medina's security was threatened. Instead of, punishing the Jews by going to war against them for their breach of contract, Messenger Muhammad (pbuh) resorted to a less violent strategy. He provided them with an alternate abode and asked them to vacate Medina itself. Apparently, this arrangement came into effect without resort to much violence. The Quran describes it in Chapter 59.

"He it is Who caused those who disbelieved of the people of the book to leave their homes after the first battle. You deemed not that they would leave their home while they thought that their fortresses would defend them against Allah. But Allah came to them from a place they expected not and cast terror into their hearts. They demolished their houses with their own hands (to deny their use to the resident Muslims of Medina). Some others were demolished by believers (as found necessary to ensure Jews' exodus). And had it not been that Allah had decreed for them the exile, He would certainly have inflicted on them a bigger punishment in this world…" 59/2

The Muslims had to use a minimum force to enforce this agreement.

"Whatever palm tree you cut down or leave it standing upon its roots, it is by Allah's permission, and that He may abase the transgressors. " 59/5.

The Muslims came into possession of some property left behind by the Jews. Disposal of such property acquired not as a result of a war is being discussed in later paragraphs. Briefly;

"And whatever Allah restored to His Messenger from them, you did not press forward against it any horse or any riding camel…" 59/6.

The Jews, as is their habit, have alleged a wholesale slaughter by Messenger Muhammad (pbuh) on this occasion. Unfortunately, some Muslims have believed the Jews' concocted story to be accurate. This, in spite of a clear narration of this incident by the Quran, has a peaceful solution to a possibly explosive situations in which widespread bloodshed was a possibility.

The Quran gives clear guidance on the disposal of prisoners of war as well as spoils of war. The Arab custom on both those counts was well known and practiced for centuries. The prisoners were made slaves, to be bought and sold in the market or used in households. Spoils of war pertained to the soldiers who captured them in battle. The Quran had brought about a new way of life.

"So when you meet your enemies in battle, smite their neck: then, when you have overcome them, make them prisoners and afterwards set them free as a favour or for ransom till the war lay down all its paraphernalia…" 47/4.

The first ransom of prisoners of war is, of course, an exchange of prisoners. Also, the enemy is made to pay damages for initiating destructive wars. If none of this is possible in full, then the prisoners are to be released as a matter of favour. Thus slavery, a blot on dignity of man, is eliminated. As far as spoils of war are concerned, the Quran forbids individuals to own any things they capture. All spoils of war become a collective property of the state. The Quran recommends.

"The retention of a fifth by Allah and Rasool which is to be distributed amongst those affected by war…" 8/41.

As for other properties which come in Muslims possession after a war, not necessarily in battlefield, are to become state property and spent at the discretion of administrators for the general good of the people.

“Whatever comes into the possession of the Messenger (not necessarily as a result of fighting in a battlefield), all of it is to be retained by God and His Messenger (The State) and distributed at their discretion (among whom many have been listed in 59/7-9), in such a manner that the riches do not keep circulating between the rich among you. And, whatever the Messenger gives you accept it and whatever he forbids you, abstain from it (with grace)... “ 59/7

The Quran gives broad guide lines for the distribution of such properties. Of course, details are to be worked out as required over time.

Before I conclude the Quranic value system with regard to war and peace, I am tempted to quote an oft repeated Quranic verse.

“Certainly you have in the Messenger of Allah an excellent example for him who seeks to conform to Allah’s laws…” 33/21.

It must be noted that this *ayah* is a central point in the midst of Quranic discussion of the allies’ attack of Medina and their flight in the battle of Ahzab. In sections 2 and 3 of Chapter 33, the Quran describes how the leadership displayed by the Messenger (pbuh) in the preparation for and conduct of these battles, won the day for the Muslims. I am not arguing that this provision of the Quran asks the Muslims to consider the Messenger (pbuh) as an example only in war. Of course, the Messenger’s (pbuh) conduct in all situations is a brilliant and model example for the Muslims. But it may be permissible to arguing that such a practice in critical situations like a war is worth an emphasis to be put into practice.

****